ISSN 0974-7346

اکتوبر ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۱۰

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ ربیع الاول ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۲۳ء | عدد ۱۰

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

ملک کی آزادی کے بعد ہی سے ایسے واقعات پیش آنے لگے جن کو دیکھ کر یہ احساس بڑھتا گیا کہ جمہوریت، مذہبی غیر جانبداری، انصاف کے حصول اور عام معاشرتی زندگی کے حقوق و واجبات میں مساوات جیسے وعدوں کا پاس ولحاظ مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔اس احساس کے باوجود امید کی کچھ کرنیں بھی تھیں کہ نام نہاد ہی سہی، سیکولرزم اور جمہوریت کی نام لیوا جماعتوں کے وجود سے حالات بہتر ہو سکیں گے۔ مگر جیسے جیسے ملک کی آزادی کی عمر بڑھتی گئی توقعات کے سایے گھٹتے گئے۔ملک کی سیاست نعروں سے تو پر شور ہوتی رہی لیکن سیاست کا اصل محور بلکہ نشانہ وہ اقلیت بنادی گئی جس نے فراخ دلی، رواداری اور ملک کی ترقی اور نیک نامی اور اس کے لیے جان ومال کی قربانی کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھا۔اقلیت دشمنی کے اس انداز نے نئے آزاد ملک میں حیرت کے ساتھ ان اندیشوں کا ادراک بھی کیا جس کی آہٹ قریب ایک صدی قبل سرسید جیسے عالی ظرف نے محسوس کی تھی اور بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہہ کر اس کو ظاہر بھی کر دیا تھا کہ ”ہندوستان کی قوموں میں صلح اور اتفاق کا مادہ نہایت ہی کم ہے۔ان کا جو فعل ہے گویا ایک نفاق کا سامان ہے، ہر چند اس باب میں کوشش کی جاتی ہے کہ یہاں کے باشندے محبت اور یکجہتی کے عادی ہوں اور صلح کا رنگ جمائیں مگر جب دیکھو ایک نیا سامان فساد کا پیدا ہوتا ہے...“۔

***

سرسید کی اس عاقبت اندیشی کو ممکن ہے ۱۸۷۲ء میں کسی اور مقصد پر محمول کیا گیا ہو لیکن ۱۹۷۲ء آتے آتے ایک اور صاحب معارف کی حقیقت شناسی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی کہ ”یہ فخر تنہا ہندوستان کو حاصل ہے کہ یہاں مسلم دشمنی کے لیے مستقل جماعتیں قائم ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کو مٹانا ہے، ان کا ہر طبقہ اپنے اپنے دائرے میں اس کام کو انجام دے رہا ہے“۔ ۱۹۷۲ء میں ملک جن خرابیوں سے دوچار تھا اس کا بنیادی سبب اس وقت یہ بتایا گیا کہ فرقہ پرست جماعتوں کی فسطائی ذہنیت، تعصب، تنگ نظری، قوت کا گھمنڈ، اقتدار کی ہوس اور اپنی برتری اور بالادستی کا احساس ہے۔اس وقت کہا گیا تھا کہ اس ذہنیت کا نشانہ اگرچہ سب سے زیادہ مسلمان ہیں لیکن یہ وہ وبا ہے جس کا اثر کسی اقلیت اور کسی فرقہ تک محدود نہیں رہتا۔

قریب نصف صدی کے بعد معارف کے یہ الفاظ اپنی دوربینی اور عاقبت اندیشی کے اعتراف پر مجبور کرتے ہیں۔ملک عزیز میں فسطائیت کے عروج کے قریب دس سالوں نے جہالت، نفرت، تعصب،

فتنہ گری، قومی نفاق اور عداوت کا وہ بازار گرم کردیا جس کی پیشین گوئی کی جاچکی تھی۔ فتنہ پرداز طبیعتوں اور فاسد فطرتوں کی ایک پہچان یہ بھی بتائی گئی کہ وہ بے گناہوں کو مجرم دکھا کر اپنے فساد زدہ افعال کو پردۂ خفا میں رکھنے کی مہارت رکھتے ہیں، اور ہر اس ذریعہ اور راستہ کو بھی مسدود کرنے میں پوری طاقت صرف کرتے ہیں کہ جس سے قانون اور انصاف خود پابند حدود و قیود ہو جائے۔ اور جہاں زبانیں بات کرنے کو اس لیے ترسنے لگیں کہ محفل میں زبان بندی کے دستور کا نفاذ عمل میں آچکا ہو۔

***

دس سال پہلے شاید ہی ایسا ماحول دیکھا گیا ہو کہ ساری صبحیں اور ساری شامیں کسی نہ کسی نئے فتنے اور کسی طرز ستم کی ایجاد سے خالی گزری ہوں۔ اخباروں کے کالم ہوں یا رسالوں کے اداریے، فریاد اور نوحہ خوانی کے لیے بھی فرصت نہیں کہ کس کس کا ماتم کیا جائے۔ مذہب، زبان، تہذیب، ثقافت سب ایک اقلیت کے لحاظ سے ہدف تنقید و تحقیر بنا کر اقتدار کے نشہ میں بے خود اور بے مہار ہونے کی مثالیں، انسانوں کی تاریخ میں پہلے بھی گزر چکی ہیں لیکن جو منظر ہمارے ملک نے اکیسویں صدی کے ایک عشرہ کے مرقع میں دیکھ لیا، شاید جھوٹ، مکر، فریب، غرور، تکبر، انانیت اور حق و صداقت کے ہر حرف کی پامالی کے یہ نقوش یہ رنگ کسی اور تصویر میں اس بے ہنری بلکہ بے شرمی سے کبھی استعمال نہیں کیے گئے۔

بے کسی و بے بسی کا درد ہے کہ پریشاں ہے کہ کہاں کہاں سے اٹھے، سارے جسم کے چھلنی ہونے کی تعبیر کبھی محض ایک شاعرانہ خیال ہونے کے لیے داد طلب تھی، لیکن ہر روز کسی بے گناہ کو اس لیے ختم کیا جانا کہ اس کا گناہ اس کے نام اور اس کی پوشاک سے ظاہر ہے، صدیوں سے خدا اور بندے کے تعلق اور صرف روحانیت کی فضا میں سانس لینے کی گنجائش والی پاکی اور پاکیزگی کی مظہر عمارتوں پر حملے صرف اس لیے کہ وہاں بھی کچھ خدا پرست انسان اپنے طریقہ بندگی پر عمل پیرا ہیں، نیک کاموں کے لیے انسان کی محنت اور دولت کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی زمینوں کو خلق خدا کی راحت کے لیے وقف کی جانے والی اور قانونی لحاظ سے ہر طرح جائز زمینوں کو بالکل ناجائز اور ظالمانہ طور پر اپنے قبضہ میں لینا، قاتلوں کی گرفتاری کے مطالبہ پر مظلوموں کی آواز اٹھانے والوں ہی کو داخل زنداں کر دینا، اور ہر ظلم و ستم کی آواز اور فریاد پر خاموش رہ کر صرف اپنی تعریف اپنی ہی زبان سے ادا کرنے کے فرعونی عمل کی تجدید کرنا یہ سب اب روزمرہ کا معمول ہے۔ لیکن اس معمول میں ایک غیر معمولی اضافہ اس وقت ہوا جب پارلیمنٹ کی نئی عمارت نے وہ منظر دیکھا جو شاید پارلیمانی تاریخ کا سب سے چشم کشا اور عبرت،

حیرت اور حسرت کا سبب تھا۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کی سخت کلامی حتی کہ باہم دست و گریباں ہونے کی تصویریں اچھوتی نہیں، ممبروں کے طیش و غیظ کو قابو میں لانے کے لیے پارلیمنٹ کے مارشلوں کو بھی ایوان میں آتے بارہا دیکھا گیا لیکن ایک قدیم اور تاریخی روایات کی شاہد عمارت سے منتقل ہو کر جدید عمارت کے در و دیوار سے ہم آہنگ ہونا، فطری طور پر تہذیب اور شرافت کے اصولوں کی پاسداری کا الگ ہی تقاضا ہے۔ لیکن نئی سجی سجائی عمارت کا نقاب رخ سے سرکا ہی نہیں تھا کہ ساری چمک دمک اس وقت دھندلی ہو گئی جب ایک اتراتے ہوئے شہ کے مصاحب ہونے کے زعم میں پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے دوسرے ممبر کو اس کے مذہب کے حوالے سے زہر آلود الفاظ کے تیروں کا نشانہ بنادیا، پارلیمانی الفاظ کی اپنی ایک لغت ہے، آداب مجلس کے رمز شناسوں کی یہ لغت اپنی خصوصیات کی وجہ سے نمایاں اور الگ شناخت رکھتی ہے۔ مگر جب کوئی واقعتاً بے آبرو، کسی تملق پرست بادشاہ کا مصاحب بن کر اترانے پر اترتا ہے تو اس کے لیے سگان بازاری اور حاضرین مجلس کے لیے فرق کرنے کی توقع ہی عبث ہے۔

***

اس واقعہ پر ملک کے ہر شریف شہری کو صدمہ ہوا اور اس کا اظہار بھی ہو رہا ہے، لیکن جس قوم کا آشوب نامہ ہر روز اور ہر ماہ لکھا اور سنا جاتا ہے کیا اس کو سنجیدگی سے اپنا جائزہ لینے اور عزت و غیرت کے ساتھ جینے کی راہوں کو تلاش کرنے کا وقت اب بھی نہیں آیا؟ اس قوم کے پاس اس کی تعداد کے تناسب سے قائدین کی کمی نہیں، لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان کی بڑی تعداد قاعدین میں بدل گئی ہے، قول حق ہے کہ ایمان والے کی فراست پر ایمان رکھو، پھر یہ ایمان والے، اپنے وجود، اپنے دین کے وجود، اپنی تہذیب اور زبان کے وجود اور سب سے بڑھ کر حق کے وجود کے لیے کسی مرد راہ داں کے انتخاب میں اپنی فراست کے جوہر کو گم کیوں کر دیتے ہیں؟ ایسا نہیں کہ یہ سوال پہلی بار زبان پر آیا ہو، ہم تو یہی سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ حالات کے ابتلا یا ذمہ داری سے مسلمان خود بھی بری نہیں ہیں، اپنی خامیوں پر ان کی نظر نہیں جاتی، سب سے بڑی خامی تو یہی ہے کہ اس ملک میں زندہ رہنے اور باعزت زندگی گزارنے کا جیسے کوئی نصب العین نہیں جس کے ذریعہ وہ ایک مرکز پر جمع ہو سکیں، قوتیں ہیں لیکن منتشر، انتشار کے عالم میں سب سے زیادہ نقصان ان سے پہنچتا ہے جن کی اصل حقیقت تہذیب حاضر کے اس غازہ میں چھپی ہوتی ہے جس کو دانشوری کا نام دے دیا گیا ہے۔ ایمانی فراست واقعی ہو تو ہر خامی دیکھی جاسکتی ہے اور اس کا ازالہ بھی ممکن ہے۔

مقالات

۲۱ویں صدی کا ایک عظیم محقق: محمد مصطفی الا عظمی

شکیل الرحمن

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

shakeelmau7@gmail.com

علم و تحقیق کی دنیا میں ایک اہم نام محمد مصطفی الا عظمی (۱۹۳۰۔۲۰۱۷) کا ہے۔ وہ اس عہد کے ایک بڑے محقق تھے۔ اپنی تحقیق کے ذریعہ انہوں نے کتاب و سنت کی اشاعت و فروغ میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن عوام و خواص کی اکثریت ان کے کاموں سے نابلد ہے۔

ان کے جد امجد حاجی رستم مئوناتھ بھنجن کے شمال مشرق میں آٹھ کلو میٹر دور علی نگر نامی ایک گاؤں ،جو امورائن کے نام سے جانا جاتا ہے، کے باشندہ تھے۔ حاجی رستم کے ایک صاحبزادے کا نام نور محمد تھا، جن کی شادی مئوناتھ بھنجن کے محلہ پورہ نظام میں ماجد خلیفہ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس سے ان کے سلیمان اور عبدالرحمن نامی دو صاحبزادے تھے، جنہیں وہ بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت ان کے ننہال میں ہوئی اور یہیں پر انہوں نے محلہ کیاری ٹولہ میں سکونت اختیار کی۔ مؤخر الذکر کی آٹھ اولاد میں محمد مصطفی الا عظمی دوسرے نمبر پر تھے اور وہ اس خاندان میں تنہا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی زندگی کا نصف اول زبردست آزمائشوں میں گزرا۔ شوق علم اور دین اسلام کے تئیں اخلاص وللٰہیت کے جذبے نے مصائب کے ایام میں بھی انہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔

احوال و کوائف: سرکاری دستاویزات کے مطابق محمد مصطفی الا عظمی کی ولادت سنہ ۱۹۳۰ء[1] میں مئوناتھ بھنجن کے محلہ کیاری ٹولہ کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ نسلی اعتبار سے ان کا تعلق انصاری برادری

---

[1] یہ ایک مفروضہ تاریخ ہے جو ان کے تمام دستاویزات پر لکھی ہوئی ہے۔ اس تاریخ کی تعیین انہوں نے اس وقت کی جب ۱۹۸۱ء میں سعودی شہریت ملنے کے بعد اپنے سارے دستاویزات کو درست کروایا تھا۔ ورنہ ان کا خود

سے تھا۔ چوں کہ ۱۹۸۹ء تک مئو ضلع اعظم گڑھ کا ایک مشہور صنعتی قصبہ تھا، اسی نسبت سے وہ خود کو اعظمی لکھتے تھے اور اسی نام سے پوری دنیا میں جانے گئے۔ لیکن اہل مئو انہیں ''مولانا مصری'' کے نام سے جانتے ہیں، کیونکہ وہ سرزمین مئو ناتھ بھنجن کے پہلے فرد تھے جنہوں نے مصر کی الازہر یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔

ولادت کے تقریباً ۸ یا ۹ ماہ بعد ہی ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد ان کے والد نے عائشہ نامی ایک خاتون سے شادی کی۔ سوتیلی ماں کے سخت رویے اور والد کی شفقت و محبت کے بیچ انہوں نے ہوش سنبھالا۔ چوں کہ والد ایک عالم دین تھے اس لئے انہوں نے قاعدہ بغدادی اور ناظرہ قرآن انھیں کے سامنے مکمل کیا۔ اس کے بعد علاقے کے پرائمری اسکول راج اور مڈل اسکول مغل پورہ سے بالترتیب پرائمری و منشی درجے کی تکمیل کی۔ اس کے بعد وہ عربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا اور چار سال تک یہاں کے اساتذہ سے استفادہ کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد کا رخ کیا لیکن بمشکل چند ماہ گزرے تھے کہ ایک جان گسل حادثے کے سبب اسے چھوڑ کر دارالعلوم دیوبند سے منسلک ہوئے اور چار سال بعد یہاں سے ۱۹۵۲ء میں سند فراغت لے کر گھر واپس ہوئے۔ انھیں انگریزی زبان سے کافی زیادہ دلچسپی تھی اس لیے دیوبند میں تعلیم کے دوران اسماعیل نامی ایک افریقی طالب علم سے انگریزی زبان سیکھی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہائی اسکول اور سینئر سکنڈری کا امتحان پاس کیا[2]۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں جامعہ ازہر سے ایم۔ اے۔ کی سند حاصل کی۔ پھر ایک لمبے وقفہ کے بعد ۱۹۶۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ان کا تعلق ایک کسان و بنکر گھرانے سے تھا، جہاں پر زندگی کی گزر اوقات کے لئے روزانہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی کھیتوں میں تو کبھی کرگھے[3] پر، اس وقت تک پاور لوم کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے عیش و عشرت کے بجائے محنت و جفاکشی کی زندگی کو دیکھا۔ اوپر سے

اپنا بیان ہے کہ ''ایک غالب اندازے کے مطابق میرا سن ولادت ۱۹۲۹ء ہے۔'' جب کہ ان کے پہلے پاسپورٹ پر تاریخ ولادت ۲۱/اپریل ۱۹۳۲ء لکھی ہوئی ہے۔

[2] یہ بات ہم سے مولانا اشتیاق اعظمی نے بیان کی ہے، جو محمد مصطفیٰ الاعظمی کے سالے مولانا مشتاق قاسمی کے فرزند ہیں۔

[3] یہ کپڑا بُننے کی مشین تھی، جو ہاتھ اور پیر کی مدد سے چلتی تھی۔ اب پاور لوم نے اس کی جگہ لے کر بُنکر طبقہ کو اس مشقت سے بڑی راحت دی ہے۔

والدہ کے سوتیلے رویے کی ایک الگ کہانی تھی۔ وہ کسی بھی طرح ان کی تعلیم کے حق میں نہیں تھیں۔ ان کا ماننا تھا کہ انسان اتنا پڑھے کہ جوڑنا گھٹانا آجائے۔ اسی وجہ سے پرائمری کے بعد جب انہوں نے ان کی تعلیم موقوف کرنی چاہی تو انہوں نے اپنے والد سے یہ سمجھوتہ کیا کہ میں جتنا وقت اسکول میں گزاروں گا اتنی دیر گھر پر کام بھی کروں گا۔ اس طرح ان کا تعلیمی سلسلہ بحال ہوا اور اپنی طاقت کے مطابق گھر کا کام کرنے لگے۔ گھریلو کام کے علاوہ شہر سے تقریباً پانچ کلومیٹر دور اموراَئن میں موجود کھیتوں میں کام اور ان کی نگہبانی کے لئے پیدل آتے جاتے تھے۔ نیز ہر دوسری رات انہیں اپنے بڑے بھائی اختر حسن کے ساتھ انہیں کھیتوں میں گزارنی پڑتی تھی، اور صبح سویرے وہیں سے پیدل اسکول بھی جانا ہوتا تھا۔ دوری کے سبب جب کبھی اسکول پہونچنے میں تاخیر ہو جاتی تو استاد کی ڈانٹ بھی سننی پڑتی تھی۔ بعض اوقات تو کلاس روم سے باہر نکال دیے جاتے۔ ۱۹۴۳ء میں درجہ منشی کی تکمیل کے بعد جب مزید پریشانیوں کا سامنا ہوا اور والد صاحب بھی انگریزی تعلیم کے مخالف ہو گئے[4] تو ایک دن چپکے سے انہوں نے گھر چھوڑ دیا اور علاقے کے نواح میں کسی اسکول میں رہنے لگے۔ تلاش کے بعد جب والد صاحب کو ان کا سراغ لگا تو وہ انہیں یہ کہہ کر گھر لائے اگر پڑھنا ہی ہے تو گھر پر رہ کر عربی تعلیم حاصل کرو۔ یہیں سے ان کا تعلیمی رخ تبدیل ہوتا ہے اور وہ دار العلوم مئو میں داخلہ لیتے ہیں۔ چار سال بعد سوتیلی ماں جب ان کی عزت پر سوالیہ نشان لگاتی ہے تو وہ گھر چھوڑ کر بنارس میں ایک ڈاکٹر کے یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں[5]۔ چند ماہ بعد جب ڈاکٹر سے معاملات بگڑتے ہیں تو ملازمت ترک کر کے اپنی منزل کی تلاش میں راستے کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے دار العلوم دیوبند پہونچتے ہیں۔ یہاں سے فراغت کے بعد وہ گھر واپس تو لوٹ آتے ہیں لیکن شوق تعلیم و آزمائش کا سلسلہ ابھی باقی رہتا ہے۔ تنگدستی کے باوجود اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر کا قصد کرتے ہیں تو مئوناتھ بھنجن کے اہل خیر حضرات کے تعاون سے سفر خرچ کا انتظام ہوتا ہے لیکن ہندوستان میں مصری سفارت خانہ ویزا جاری کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بغیر ویزا کے مصر جانے کا پختہ ارادہ کیا اور پہلے ممبئی سے سمندری جہاز کے

---

[4] مولانا اشتیاق اعظمی (فرزند مولانا مشتاق قاسمی) نے ہمیں بتایا کہ ان کے والد برطانوی حکومت اور انگریزی زبان و تعلیم کے اس قدر مخالف تھے کہ وہ ہمیشہ ان سے یہ کہتے کہ بیٹا سنسکرت پڑھ لو لیکن انگریزی کو چھوڑ دو۔

[5] یہ واقعہ محمد مصطفیٰ الاعظمی کے بھتیجے مشتاق احمد بن اختر حسن اور ابو الکلام بن مرتضی نے انہیں کے حوالہ سے مجھ سے بیان کیا ہے۔

ذریعے عراق گئے۔اس کے بعد خشکی کے راستے لبنان تک کا پیدل سفر کیا۔ پھر بیروت سے مصر کا سیاحتی ویزا لے کر اسکندریہ پہونچے۔ یہاں سے جب قاہرہ پہونچے تو پیسہ و توشہ ختم ہو چکا تھا اور نماز کا وقت بھی ہو گیا تھا، چنانچہ انہوں نے مسجد کا رخ کیا۔ مسجد میں عبداللہ بن عقیل العقیل نامی ایک شخص نے ان کی حالت دیکھ کر تفصیل دریافت کی اور ان کے شوق تعلیم کو دیکھ کر انہیں پانچ مصری پاؤنڈ دیے اور داخلے کی کارروائی میں مدد کی[۶]۔ مصر میں تعلیم کے دوران کچھ اخوانی طلبہ مثلاً احمد العسال اور الصفطاوی وغیرہ کے ساتھ ان کے اچھے روابط ہو گئے۔اسی سبب ۱۹۵۴ء میں اخوانیوں کی گرفتاری کے وقت انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں ہندوستانی سفارت خانہ کے تدخل سے رہائی ملی[۷]۔

۱۹۵۵ء میں جامعہ ازہر سے فراغت کے بعد انہوں نے پہلے حج کیا پھر وطن واپس آکر تصریف نامی ایک خاتون سے شادی کی۔اس کے بعد وہ بغرض ملازمت قطر گئے اور وہاں پر انجینئرز، ڈاکٹرز اور سرکاری نرسوں وغیرہ کو عربی زبان سکھانا شروع کیا۔ چندماہ بعد قطر پبلک لائبریری کے سیکریٹری مقرر ہوئے اور ۱۹۶۸ء تک اس ذمہ داری کو انجام دیا۔اس عرصے میں جوزف شاخت کی کتاب ''اصول الفقہ المحمدی'' ان کے ہاتھ لگی۔ اس کے مطالعے کے بعد انہوں نے اس کا علمی جواب لکھنے کا پختہ ارادہ کیا۔ لیکن اس کے لیے اعلیٰ ڈگری درکار تھی چنانچہ غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ اپنے ذاتی خرچ پر کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کریں گے۔اس کے بعد انہوں نے اپنی ایک سال کی چھٹی جمع کی اور مزید ایک سال کی بلا تنخواہ چھٹی لے کر ۱۹۶۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے پیمبروک کالج سے ''اسٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر'' کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد ''آن شاختس اوریجنس آف محمڈن جورسپروڈینس'' کے نام سے اس کا جواب لکھا۔اس طرح انہوں نے مستشرقین کے شکوک و الزامات کو مدِ نظر رکھ کر کتاب وسنت سے متعلق مختلف تحقیقی کام کیے اور جامعہ ملک سعود، ریاض کے علاوہ مغرب کی مختلف جامعات میں تدریسی و تعلیمی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ ۲۰؍ دسمبر ۲۰۱۷ء کو ان کا انتقال ہوا اور قبرستان محلہ نسیم، ریاض، سعودی عرب، میں تدفین ہوئی۔

---

[۶] Velasco,Taris Ahmad-von."Muhammad Mustafa al-Azami (1930-2017) obituary",*Hikmah,* vol.9:2, Oct.2018, p.251

[۷] القرضاوی، یوسف عبداللہ: في ذمة لله.. علامة السنة النبوية والثقافة الإسلامية أ. د. محمد مصطفی الأعظمي۔ روزنامہ العرب (۲۵/دسمبر ۲۰۱۷ء)

تحقیقی کارنامے: ۱۹۶۸ء میں انہوں نے لائبریری کی ملازمت ترک کرکے خود کو درس وتدریس اور بحث و تحقیق کے لیے وقف کردیا۔ جامعہ ملک سعود، ریاض، میں تدریس کے علاوہ انہوں نے مستشرقین کے خلاف علمی جنگ کا آغاز کیا اور تاوفات اسی میں منہمک رہے۔ ان کے تحقیقی کام کا آغاز ان کے پی ایچ۔ ڈی۔ مقالے سے ہوتا ہے اور النص القرآنی الخالدعبر العصور پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے انھوں نے عربی وانگریزی زبان کو ترسیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے کاموں کا مطمح نظر کتاب و سنت کا دفاع واشاعت ہے۔ ان کے تحقیقی کام تین نوعیت کے ہیں: اول نادر مخطوطات کی تلاش و اشاعت، دوم کتاب وسنت پر الزامات کا علمی و تحقیقی جواب اور سوم اسلام و مسلمانوں کی بقاء و برتری کے اثبات کے لیے جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال۔

قطر میں لائبریری میں کام کے دوران نادر مخطوطات کی تلاش ان کا خاص شوق بن گیا تھا۔ اس لیے جب انہوں نے تحقیق وتصنیف کی دنیا میں قدم رکھا تو کتاب التمييز للامام مسلم، مؤطأ الامام مالك برواية الليثي، العلل لعلي بن عبدالله المديني، مغازي رسول الله لعروة بن الزبير برواية ابي الاسود، صحیح البخاری بکتابۃ النویری، سنن ابن ماجہ، السنن الکبری للنسائی اور صحیح ابن خزیمۃ جیسے نادر مخطوطات کی تحقیق و تخریج کرکے اپنے قیمتی مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ ان مقدموں میں انہوں نے مؤلف کی حالات زندگی، طریقۂ تالیف، کتاب کی اہمیت وافادیت، اس کا تاریخی ثبوت، اس کے متعدد نسخے اور اس کے ملنے کی جگہ کا تفصیلی تذکرہ خصوصیت کے ساتھ کیا۔ ان تمام مخطوطات میں سب سے اہم مخطوطہ صحیح ابن خزیمۃ کا تھا۔ جس کے متعلق ماہرین کا ماننا تھا کہ وہ دنیا سے غائب ہوچکا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں انھیں ترکی کے مکتبہ احمد ثالث، استنبول میں ایک گرد آلود مخطوطہ ملا جس کے شروع و آخر کے کچھ صفحات غائب تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ نسخہ "صحیح ابن خزیمۃ" ہی کا ہے۔ اور یہ کتاب ساتویں صدی ہجری میں حافظ منذری، علامہ دمیاطی اور علامہ زیلعی وغیرہ کے ذریعہ صحیح ابن خزیمہ کے نام سے معروف ہوئی، جب کہ اس سے قبل اس کا تذکرہ "مختصر المختصر من المسند الصحیح عن النبی ﷺ" کے نام سے ملتا ہے اور مصنف نے بھی یہی نام دیا۔ آپ نے کتاب کے شروع میں ۳۳ صفحہ کا ایک مقدمہ لکھا جس میں ابن خزیمہ کا مکمل تعارف، مصنفات، اہل علم کے بیچ ان کی معنویت اور کتاب سے متعلق قیمتی معلومات کو جمع کیا ہے۔ اس کتاب کی جو حدیثیں صحیحین میں موجود ہیں ان پر صرف احالہ سے کام لیا۔ جب کہ غیر صحیحین پر صحت وضعف کا حکم بھی لگایا ہے۔ پھر اس کی تائید وتوثیق کے لئے علامہ البانی سے نظر ثانی کرائی اور جہاں شیخ کا

اختلاف ہو ااس کو بھی بیان کیا۔ نیز کتابوں کے احالہ کے لئے آپ نے المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث کے رموز کو اختیار کیا ہے سوائے ''مسند احمد بن حنبل'' کے، اس کے لئے ''حل'' کے بجائے ''حم'' کا رمز استعمال کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء کو بیروت سے شائع ہوا۔

مخطوطات کی تحقیق و تخریج کے علاوہ انہوں نے دشمنان اسلام بالخصوص مستشرقین کی جانب سے کتاب و سنت پر اٹھائے گئے سوالات کا بھی علمی و تحقیقی جواب دیا۔ اس سلسلے میں ان کی پی ایچ۔ڈی۔ مقالہ ''اسٹڈیز اِن اَرلی حدیث لٹریچر'' کافی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ یہ مقالہ مستشرقین کے علاقے میں، انھیں کے خلاف، انھیں کی نگرانی میں اور انھیں کی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس کے تکمیل پر جب انہوں نے اسے اپنے کچھ مسلم ساتھیوں کو دکھایا تو انہوں نے مستشرقین کے عقیدہ کے خلاف کچھ باتوں کو حذف کرنے کو کہا تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور جب شفہی امتحان میں ممتحن کی جانب سے یہ سوال ہوا کہ اگر اس مقالے سے کچھ باتوں کو نکال دیا جائے تو آپ کیا کریں گے؟ اس کے جواب میں انہوں نے برجستہ کہا کہ اگر آپ میرے مقالہ کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں تو بالکل ایسا کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہی مقالہ ہے جس کو ان کے سپروائزر پروفیسر اے۔ جے۔ آربری نے عہد جدید میں علم حدیث سے متعلق تحقیقی کاموں میں ایک بہترین تحقیق قرار دیا ہے[۸]۔ انہوں نے اس مقالے کا عربی ترجمہ دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخہ و تدوینہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ اسی طرح مستشرقین نے جب محدثین کے طریقہ کار پر سوال اٹھایا تو انہوں نے عربی و انگریزی دونوں زبان میں کتاب لکھ کر اس کا مسکت جواب دیا۔ اپنی عربی تصنیف منہج النقد عند المحدثین: نشأته و تاریخه میں انہوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ احادیث کی جانچ و پرکھ کے لیے محدثین نے جو طریقہ استعمال کیا ہے پوری دنیا اس سے بہتر اصول نہ بنا سکی ہے۔ نیز اہل مغرب نے انھیں اصولوں کو اپنی زبان میں منتقل کرکے اسے اپنے نام کر لیا ہے۔ اسی طرح ان کی انگریزی کتاب ''اسٹڈیز اِن حدیث میتھاڈولوجی اینڈ لٹریچر'' میں علم حدیث کی مختصر تاریخ، طریقہ کار اور حدیث کی بارہ مشہور کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے قرآن کی ابدی سالمیت و غیر محرف ہونے کا علمی، عقلی اور تاریخی ثبوت اپنی کتاب ''دی ہسٹری آف قرآنک ٹیکسٹ'' اور ''اتیج لیس قرآن ٹائم لیس ٹیکسٹ'' میں دیا ہے۔ یہ

---

[۸] Azami, Muhammad Mustafa. *Studies in Early Hadith literature*, Al-Maktab Al-Islami, Beirut, 1978 (Foreword).

دونوں کتابیں پوری چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی و منفرد کتاب ہیں۔ اول الذکر کتاب ٹوبی لیسٹر[۹] (Toby Lester) کے مضمون "قرآن کیا ہے" کا جواب ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ چودہ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں جاہلی عہد، محمد ﷺ کی حالات زندگی، عہد خلافت راشدہ، نزول قرآن، قرآنی تعلیمات، مختلف ادوار میں قرآن کی جمع و تدوین، نقطہ و اعراب سازی، مصاحف و قرأت کے اختلاف کے اسباب اور مسلم طریقہ تعلیم وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ دوسرے حصے میں یہود و نصاری کے تاریخی تذکرے کے ساتھ توریت وانجیل کا تفصیلی و تحقیقی تقابل ہے۔ تیسرے حصہ میں قرآن سے متعلق مستشرقین کے طریقہ کار اور اس کا جواب ہے۔ مؤخر الذکر کتاب ان کی آخری تصنیف ہے جس میں انہوں نے مکمل سورہ الاسراء کے ایک ایک حرف کا مقارنہ پہلی صدی ہجری سے پندرہویں صدی ہجری تک کے ۱۹ مصاحف سے کیا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل میں انھیں کل پندرہ سال لگے۔ اس کتاب کو انہوں نے عربی و انگریزی دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع کیا ہے۔

کتاب و سنت کے متعلق مستشرقین کے اشکالات کی تردید کے ساتھ انہوں نے اس سے متعلق غیر معروف معلومات کو بھی عوام و خواص کے سامنے واضح کیا۔ اس ضمن میں ان کی دو تصنیفات بہت اہم ہیں، ایک "كُتّاب النبی ﷺ" اور دوسری "المحدثون من اليمامة"۔ پہلی کتاب میں انہوں نے ان صحابہ کرام کا تذکرہ کیا ہے جن سے نبی کریم ﷺ نے کتابت وحی کا کام لیا ہے۔ ان کی تحقیق سے قبل مؤرخین کے یہاں کاتبین وحی کی تعداد عام طور سے ۴۰ یا ۴۵ رہی ہے۔ لیکن مصنف نے اپنی گرانقدر تحقیق و جستجو کے بعد ان کاتبین وحی کی تعداد ۶۵ بتائی ہے۔ اور ان سب کے ثبوت کے لیے مضبوط تاریخی شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ "دی اسکرائبس آف دی پروفیٹ" کے نام سے کیا ہے۔ اہل علم کے درمیان یمامہ کو فتنوں کی سرزمین تصور کیا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ یہاں کی

---

[۹] لیسٹر ایک امریکی صحافی اور مصنف ہے۔ اس نے ماہنامہ "اٹلانٹک" کے جنوری ۱۹۹۹ء کے شمارہ میں "قرآن کیا ہے" کے عنوان پر ایک مضمون لکھا، جس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اللہ کا غیر محرف کلام ہے، لیکن وہ علمی دنیا میں اس دعوی کو ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔ محمد مصطفی الاعظمی نے اس چیلنج کو قبول کیا اور توریت و انجیل کے تقابل کے ساتھ قرآن کی تاریخ کو مضبوط دلائل کے ساتھ مرتب کیا۔

علمی سرگرمیوں پر لوگوں کی توجہ کم رہی ہے۔ لیکن انہوں نے خذ ماصفا ودع ماکدر کے تحت علم حدیث کے میدان میں اہل یمامہ کی خدمات کو سب سے پہلے زیر بحث لائے اور ۲۵۰ ہجری تک کے ۱۵۰ محدثین کا تذکرہ کرکے وہاں کی علمی معنویت کو اجاگر کیا۔ اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے۔ ان سے قبل اس موضوع پر بشمول اہل یمامہ کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔

اللہ نے حلال و حرام کے مابین تفریق اور منفعت انسانی کے پیش نظر روئے زمین پر آباد انسانوں کی رہنمائی و طرز معاشرت کے لیے جو اصول و ضوابط بنائے ہیں انہیں اسلامی اصول کا نام دیا جاتا ہے۔ کتاب و سنت کے اعلان کے مطابق یہ اصول قیامت تک کے لیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب و سنت میں دین و دنیا کی تفریق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بلکہ قرآن یہ پیغام دیتا ہے کہ آپ دنیا میں گھوم کر اپنا رزق تلاش کریں اور فتنہ و فساد سے دور امن و سلامتی کے ساتھ لوگوں کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے آخرت کی کامیابی کی فکر کریں۔ اس اصول کے تئیں محمد مصطفی الاعظمی کے یہاں کسی طرح کا کوئی شک و شبہہ نہیں تھا۔ اسی لیے برق رفتاری کے ساتھ بدلتی انسانی طرزِ زندگی اور جدید ٹیکنالوجی کے زمانے میں جب بعض مفتیان نے آسانی و تیزی سے کام کرنے والے آلات کے استعمال پر حرمت کا فتویٰ لگایا تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم اسلامی اصولوں کو ان کی وسعت و ہمہ گیریت کے بجائے کسی مخصوص عینک سے دیکھیں گے تو تنزلی اور ذلت و رسوائی ہمارا مقدر ہوگی۔ اگر سرخ رو ہو کر آگے بڑھنا اور اسلام کی تبلیغ کرنا ہے تو ہر ایک میدان میں اپنی مہارت کو ثابت کرکے اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنے تینوں بچوں کو تین الگ الگ علوم یعنی کمپیوٹر سائنس، علم معیشت اور علم طب میں اعلیٰ تعلیم دلائی۔

اسی دور رس فکر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے کتاب و سنت کو تکنیکی دنیا میں سب سے پہلے متعارف کروایا۔ اس کے ذریعے انہوں نے ایک طرف تکنیکی دنیا سے متنفر و بدظن اسلام پسند علماء و دانشوران کو اس بات کا قائل کیا کہ اسلام کی سربلندی اور اس کی حقانیت کو عام کرنے کے لیے تکنیکی دنیا میں قدم رکھنا اور ان میں کمال پیدا کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایمان کی حفاظت کے لیے شرک و بدعت سے دور رہنا۔ دوسری طرف انہوں نے اُن روشن خیال اور جدت پسند لوگوں کو، جو یہ سمجھتے اور پوری دنیا میں شور مچاتے ہیں کہ اسلام ایک تنگ نظر اور شدت پسند دین ہے، یہ پیغام دیا کہ اسلام ان کی روشن خیالی سے کہیں زیادہ روشن خیال ہے۔ اس نے حرام و حلال اور نفع و نقصان کے درمیان تمیز کو انسانیت کی ترقی و تنزلی کا معیار بنایا ہے۔ وہ پوری دنیائے انسانیت بالخصوص مسلمانوں کو انسانیت کے فائدے

کے لیے تکنیکی آلات اور نئی ایجادات کے استعمال سے کبھی منع نہیں کرتا ہے بشر طیکہ وہ چیز اللہ کی وحدانیت اور اس کی الوہیت میں مانع نہ ہو۔

ان کے اس عظیم کام کا اصل محرک مکانۃ الحدیث فی الاسلام کے عنوان سے منعقدہ سیمینار ہے۔اس سیمینار کا انعقاد امام بخاری کی ۱۲۰۰ویں میلاد کے موقع پر ۱۹۷۵ء مطابق ۱۳۹۵ھ میں متحدہ امریکہ کے شہر شکاگو میں ایم۔ایس۔اے۔ (Muslim Student's Association of USA and Canada) کے ذریعے ہوا تھا۔ اسی سیمینار میں ایک مستشرق ڈاکٹر ولیم گراہم (Dr. William Graham) نے کمپیوٹر کی مدد سے احادیث نبویہ کے بارے میں تحقیق کی بات کہی تھی۔اس سے ان کا مقصد احادیث نبویہ میں غلطیاں نکالنا اور انہیں مشکوک بنانا تھا۔ چنانچہ مصطفی اعظمی نے برجستہ انہیں جواب دیتے ہوئے کہا: ''سنت نبویہ پوری طرح سے ہر ایک چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے بشر طیکہ اس تحقیق میں غیر جانبداری کا ثبوت دیتے ہوئے انصاف سے کام لیا جائے''۔[۱۰] اس کے بعد مسلسل غور و فکر کے بعد انھوں نے اس کام کو انجام دیا۔

کتاب و سنت سے متعلق ان کی انھیں تحقیقات، گراں قدر خدمات اور اسلام کے دفاع میں اٹھائے گئے مضبوط اقدامات کے نتیجہ میں سعودی حکومت نے انھیں ۱۹۸۰ء میں شاہ فیصل عالمی ایوارڈ، ۱۹۸۱ء میں سعودی شہریت اور ۱۹۸۲ء میں کنگ خالد ایوارڈ آف میرٹ فرسٹ ڈگری سے نوازا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کے دور میں بھی اگرچہ عوام و خواص کا ایک طبقہ ان سے واقف نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا شمار ۲۱ویں صدی عیسوی کے مشہور اور جلیل القدر علمائے حدیث میں ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو ابھی تک ان کی جلالت علمی کا اندازہ نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جمعیت و جماعت سے الگ تنہا اپنے مقصد میں مشغول رہنے کے ساتھ مدح سرائی، وجی حضوری اور بلاوجہ پرچار سے بچتے تھے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر حفظ الرحمٰن صاحب نے آپ سے سوال کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ کے اتنے عظیم کام اور زبردست علمی صلاحیت کے باوجود آپ گمنام ہیں؟ اس وقت آپ نے بہت ہی معنی خیز جواب دیا ''حضرت میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں کوئی بازارو سامان نہیں جس کا پرچار کیا جائے۔''

---

[۱۰] الاعظمی، محمد مصطفی، ''مشروع خدمۃ السنۃ مرکز ابحاث الحدیث''۔ استخدام الحاسوب فی العلوم الشرعیۃ، المعہد الاسلامی للبحوث والتدریب والبنک الاسلامی للتنمیۃ، جدہ۔ ۱۴۲۱ھ/۱۹۹۲ء۔ صفحہ ۲۵۸

سیرت نگاری اور سرسید احمد خان

منیب احمد

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ (کشمیر)

wanimuneeb765@gmail.com

شبیر مقبول ماگرے

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ (کشمیر)

mrgrayshabir10@gmail.com

انیسویں صدی میں جب انگریزوں نے پورے ہندوستان پر حکومت قائم کی تو انھوں نے سیاسی قبضے کے ساتھ ساتھ مذہبی معاملات میں بھی دخل دینا شروع کر دیا، خاص کر دین اسلام کے خلاف پورے زور وشور کے ساتھ پروپگنڈہ شروع کیا تاکہ عیسائی مذہب کی تبلیغ آسان ہوسکے۔ وہ عیسائی پادری بڑی تعداد میں یہاں لائے۔ عیسائی پادریوں نے اسلام اور حضور ﷺ کے خلاف کتابیں لکھنی شروع کیں۔ اسلامی عقائد، رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور ہر چیز پر ایک ایک کر کے تنقید شروع کر دی۔ ان کی ساری کاوشوں کا ہدف اور مرکز ہندو، سکھ یا بدھ مذہب والے نہیں تھے بلکہ اسلام ان کا ہدف تھا۔ ان کے اس طریقے سے مسلمانوں کا دل دکھی ہوتا۔ اُس وقت کے مسلمانوں نے اسلام اور سیرت کے دفاع میں بڑی عالمانہ کتابیں لکھ ڈالیں اور ان عیسائی پادریوں کے منہ بند کئے۔

یہ سلسلہ ابھی اپنے آغاز میں ہی تھا کہ ہندوستان میں مقیم ایک مشہور انگریز سر ولیم میور نے (جو یوپی کا لفٹننٹ گورنر تھا) اس میدان میں قدم رکھا۔ اس نے انگریزی زبان میں The Life of Mahomet کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا چرچا چھپنے سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ایک تو انگریزی حکومت کا جاہ وجلال، انگریزوں میں بھی ایک بڑا آدمی جو عربی اور فارسی بھی جانتا تھا اور اسلامی علوم وفنون کا بھی اس نے خاصہ مطالعہ کیا تھا۔ اس نے یہ کتاب چار جلدوں میں لکھ ڈالی جو ۱۸۶۱-۱۸۶۴ء کے دوران شائع ہوئیں۔ اس کتاب نے مسلمانوں کے دل مجروح کئے۔

اس کتاب کو دیکھ کر سب سے پہلے سرسید احمد خان کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کتاب کا ایک عالمانہ جواب لکھنا چاہئے۔ سرسید نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جوں جوں کتاب کو دیکھتا ہوں دل کباب ہوتا جاتا

ہے۔ ولیم میور نے یہ کتاب براہ راست اسلامی ماٰخذ کو سامنے رکھ کر لکھی۔ مصنف عربی جانتا تھا اور اس نے خاصی محنت سے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس نے اسلامی مصادر کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ جگہ جگہ سے مواد جمع کیا پھر ایک ایک کرکے اس کو چھانٹا اور جس چیز کی وہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق تعبیر کرسکتا تھا اس کی منفی تعبیر کی۔

یہ کتاب جب شائع ہوئی تو بہت سے لوگوں نے اس پر رد عمل کا اظہار کیا لیکن پہلا مثبت اور تعمیری رد عمل سر سید احمد خان کا تھا۔ سرسید کو بعض ایسی خصوصیات حاصل تھیں جو اوروں کو حاصل نہیں تھیں۔ سرسید کی شہرت انگریزوں کے ہمدرد کے طور پر ایک عرصے سے چلی آرہی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے تحریک آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ کئی انگریزوں کی جان بچائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز سے دشمنی ختم کرنی چاہئے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے اچھے تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ جب انھوں نے ولیم میور کا جواب دینے کے لئے قلم اٹھایا تو ان کی نیت کے بارے میں کوئی انگریز شک نہیں کرسکتا تھا کہ وہ محض انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ کتاب لکھ رہے ہیں۔ ان کو جاننے والے ہر شخص کو معلوم تھا کہ وہ کس نیت سے یہ کتاب لکھ رہے ہیں۔ پھر کسی اور کے لئے ایسی جرأت کرنا شائد ممکن نہیں تھا کہ ایک گورنر کی کتاب کے جواب میں کتاب لکھنے اور اس کی تردید کرنے کی جسارت کرے۔

سرسید نے یہ طے کیا کہ وہ اس کتاب کا بہت معروضی انداز میں جواب دیں گے اور جس طرح کے دلائل ولیم میور نے اپنے بیانات اور دعوؤں کی تائید میں دیے ہیں، وہ اسی طرح کے استدلال اور جوابی دلائل سے کام لیں گے۔

جب انھوں نے ہندوستان میں اس منصوبے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ بہت سی کتابیں جو اس منصوبے کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہیں یہاں کے کتب خانوں میں نہیں مل رہی ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ بڑے بڑے کتب خانے انگریز لوٹ کر اپنے ملک لے گئے ہیں۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریری اور انگلستان کی درجنوں لائبریریاں ہندوستان اور برصغیر کی مسروقہ کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔

جن دنوں یہ کتاب نئی نئی آئی اور سرسید اس کے مضامین و مندرجات سے باخبر ہوتے جاتے تو ان کی بے چینی اور کرب بڑھتا جاتا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ ولیم میور کی کتاب پڑھ کر عیسائی سر دُھنتے اور مسلمان سر پیٹتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کام کی انجام دہی کے لئے لندن جائیں گے اور وہاں بیٹھ کر

یہ کتاب لکھیں گے۔

یوں سر سید نے لندن جا کر کتاب لکھنی شروع کی۔ لیکن انگلستان میں قیام کے اخراجات ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہاں سے وہ اپنے دوستوں اور مختلف لوگوں کو لکھ لکھ کر قرض مانگتے رہے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ قرض دینے کے لئے بھی لوگ تیار نہ ہوئے تو انہوں نے نواب محسن الملک کو لکھا کہ میرا فلاں مکان فروخت کر دو اور مجھے رقم بھیج دو۔ پھر ایک جگہ لکھا ہے کہ میرے فلاں مکان میں تانبے اور پیتل کے بہت سے برتن ہیں، وہ سارے فروخت کر کے رقم مجھے بھیج دو۔ ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ میں اس کام کے لئے بے گھر اور بے سہارا ہونے کو تیار ہوں۔ جب قیامت میں کہا جائے گا کہ لاؤ اور حاضر کرو اس فقیر اور مسکین سر سید کو جو میرے نام پر گھر بار لٹا بیٹھا تو میرے لئے یہی اعزاز بہت ہے۔ اس طرح سے انھوں نے بے سر و سامانی کے عالم میں انگلستان میں قیام کر کے ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا۔ یہ سیرت کی تاریخ میں پہلی کتاب ہے جو ایک مسلمان دانشور نے ایک غیر مسلم ملک میں جا کر غیر مسلموں کے اسلوب اور استدلال سے کام لے کر ایک غیر مسلم مصنف کی تردید میں لکھی۔ یہ ایک ضخیم کتاب تھی جو ۱۸۷۰ء میں مکمل ہوئی اور اسی سال شائع ہوئی۔ ۵۴۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا نام ''خطبات احمدیہ'' رکھا گیا۔ اس کے بارہ ابواب یا بارہ خطبات تیار کئے گئے۔

ان بارہ خطبات میں سر سید نے ایک نیا انداز اپنایا۔ مغربی تحقیقات اور تصانیف سے استفادہ کیا۔ مستشرقین کے جوابات دینے کی کوشش کی۔ مستشرقین نے بالعموم اور ولیم میور نے بالخصوص جو اعتراضات کئے تھے ان کا جواب دیا۔ ولیم میور نے کئی ایسی باتیں دہرائی تھیں جو مستشرقین ایک عرصہ سے کہتے چلے آرہے تھے۔ لیکن ولیم میور نے پہلی مرتبہ ان کے لئے کچھ شواہد اور دلائل بھی فراہم کئے تھے۔ انھوں نے ایک بڑی بات یہ کہی تھی کہ عربوں کا جو دعویٰ ہے کہ حضور ﷺ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ہیں، وہ دعویٰ غلط ہے، قریش کا کوئی تعلق حضرت اسماعیلؑ سے نہیں ہے اور یہ دعویٰ انھوں نے محض اپنی سیادت قائم کرنے کیلئے کر دیا تھا۔ سر سید کا پہلا خطبہ اسی مضمون کے بارے میں ہے۔ انھوں نے ایسے دلائل اور شواہد سے جو غیر مسلموں کو مطمئن کر سکیں یہ ثابت کیا کہ عربوں میں سے قریش کا تعلق بنی اسماعیل سے ہے اور بنی اسماعیل ہی کی اولاد کو قریش اور دوسرے قبائل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ولیم میور نے یہ بھی لکھا تھا، کہ جو بیت اللہ مکہ میں بنایا گیا یہ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ جب آدمی انکار پر اُتر آتا ہے تو پھر ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے چنانچہ ولیم میور نے دعویٰ کیا کہ مکہ میں موجود بیت اللہ حضرت ابراہیم کے بہت بعد میں بنایا گیا تھا اور بعد میں قریش اور عربوں نے حضرت

ابراہیمؑ واسماعیلؑ سے منسوب کر دیا۔ اس بے بنیاد اور فضول دعویٰ کی تردید کی خاطر سر سید نے ایک باب بیت اللہ پر لکھا ہے اور بہت تفصیلی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ بیت اللہ حضرت ابراہیمؑ کا ہی تعمیر کردہ ہے۔ اس کے بارے میں دلائل اور شواہد انھوں نے قدیم کتابوں سے، مغربی مصنفین کی تحریروں سے، جغرافیہ کی کتابوں، قدیم مذہبی کتابوں اور قدیم ادب کی کتابوں سے جمع کئے اور ان سب کو ایک منطقی ترتیب سے پیش کر دیا۔ اس طرح سے انھوں نے ایک ایک کر کے بارہ خطبات لکھے اور ان غلط فہمیوں کی تردید کر دی جو ولیم میور نے پھیلائی تھی۔

ایک بڑی اہم بات جو ولیم میور نے لکھی تھی اور جس کی تردید کے لئے سر سید نے ایک پورا باب لکھا وہ عرب کے جغرافیہ کے بارے میں تھا۔ ولیم میور نے بعض واضح جغرافیائی حقائق کو بھی جھٹلایا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے بارے میں توریت (تثنیہ ۲:۳۳) میں یہ جملہ آیا ہے:

And he said, The Lord came from Sinai, and rose up from Seir unto them; he shined forth from mount Paran… Deuteronomy 33:2 (Bible, King James Version)

(پروردگار کوہ سینا سے آیا، سعیر کی پہاڑیوں سے طلوع ہوا اور فاران کی پہاڑی سے اس کا جلوہ ہوا)۔

یہ صراحتاً رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پیشن گوئی ہے۔ فاران ہی پر حضور ﷺ پر نزولِ وحی ہوا۔ فاران ہی پر حضور ﷺ تشریف فرما تھے جب وحی کا آغاز ہوا۔ یہ ایک ایسی واضح اور دوٹوک بات تھی جس کا انکار کرنا بڑا مشکل تھا لیکن ولیم میور نے اس کا بھی انکار کیا۔ اس نے کہا کہ جو فاران مکہ میں بتایا جاتا ہے توریت کے فاران سے وہ مراد نہیں ہے بلکہ توریت کے فاران سے شام کی فلاں پہاڑی مراد ہے۔ اس کا جائزہ لینے کیلئے سر سید نے شام کے جغرافیہ کا جائزہ لیا۔ قدیم مآخذ میں شام کے جغرافیہ کا جو ذکر آیا ہے، اس کو تلاش کیا۔ وہ خود انگریزی سمیت کوئی یورپی زبان نہیں جانتے تھے۔ بلکہ لوگوں سے کام لیتے تھے، ترجمہ کرواتے تھے اور اس کے پیسے دیتے تھے۔ پیسے ان کے پاس ہوتے نہیں تھے۔ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری فنڈ نہیں تھے۔ وہ ذاتی قرضے لیکر اور اپنی جائداد فروخت کر کے یہ کام کر رہے تھے۔ ان حالات کے باوجود سر سید تحقیق کا یہ سارا کام کرتے رہے۔ پھر دلائل سے انہوں نے ثابت کیا کہ توریت میں جس فاران کا تذکرہ ہے وہ وہی فاران ہے جو مکہ میں ہے۔ سر سید نے یہ باب مکمل کیا تو خوشی کے مارے وہ بے حال ہو گئے۔ اس کے بعد جب یہ کتاب مکمل ہو گئی تو پورے ہندوستان میں کیا پورے عالم دنیا میں اس کی شہرت ہو گئی اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ کتاب خریدی۔

البیرونی کی کتاب الہند: ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد حاذق

اسسٹنٹ پروفیسر (کونٹریکچول)، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

haziq2013@manuu.edu.in

فادر آف انڈولوجی کے نام سے دسویں صدی کے مشہور مورخ ابوریحان البیرونی ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ تاریخ میں البیرونی کو ہند شناسی، ہندویات، ہندوستان کی تاریخ، ادب اور ثقافت وغیرہ کے مطالعہ کو علم ہند Indology کہا جاتا ہے[1]۔ کتاب الہند میں البیرونی نے ہندو فلسفہ، رسم و رواج، اور روایات کا معروضی مطالعہ پیش کیا ہے۔ البیرونی کو علم کی طلب نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور زبان سیکھنے کی طرف مائل کیا۔ انہوں نے تیرہ سال کا طویل عرصہ ہندوستان میں گزارا۔ کتاب کی تصنیف کے لیے ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت پر عبور حاصل کیا اور ہندو مذہب کے اہل علم اور مبلغوں سے استفادہ کرکے ہندو مذہب، زبان اور روایت کو سمجھنے کی سعی کی اور اس کو قلمبند کیا تاکہ دوسری قومیں ہندو قوم کی تہذیب کو سمجھ سکیں۔ بلاشبہ یہ کتاب ہندو مذہب کے عقائد کو بیان کرنے کے ساتھ ہندو سماج کی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ کسی بھی معاشرے کو سمجھنے اور اس کے مطالعے کے لیے مذہب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ مذہب عوام کی فکر، رہن سہن، تجارتی طور طریقوں اور دیگر ضروریات زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک تعددی معاشرے میں ہم آہنگی اور باہمی تعاون کے لیے مذہبی مفاہمت ضروری ہے۔

البیرونی کا مختصر تعارف: ابوریحان البیرونی کا نام محمد اور والد کا نام احمد تھا۔ ابوریحان کنیت تھی، پیدائش خوارزم میں ہوئی جس کی وجہ سے ابوریحان خوارزمی کے نام سے بھی مشہور ہوئے، یعنی پورا نام ابوریحان محمد بن احمد البیرونی الخوارزمی ہے۔ لیکن شہرت ابوریحان بیرونی کے نام سے حاصل ہوئی۔ وسط ایشیا کے ترکستان میں ایک علاقہ جس کا نام خیوا ہے جس کو پہلے خوارزم کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ۹، ستمبر ۹۷۳ء کو بروز جمعرات اسی خوارزم کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ کچھ مورخین کے مطابق

---

[1] آکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، مرتب و مترجم: شان الحق حقی، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۲۰۰۳، ص ۸۱۰

ان کی پیدائش صوبہ سندھ میں ہوئی اور صوبہ سندھ کے کسی علاقے کا نام بیرون تھا اس وجہ سے وہ بیرونی کہلائے لیکن تحقیق میں یہ بات غلط ثابت ہوئی، یہ خیال اس بات پر محمول ہے کہ سندھ کے کسی علاقے کا نام نیرون تھا جس کو ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے فتح کیا تھا اور غالب گمان ہے کہ نیرون کو ہی کچھ مورخین نے بیرون سمجھ لیا اور اس بناء پر رائے قائم کرلی۔ بیرونی نے عربی علوم وفنون اور یونانی فکر و فلسفہ پر دسترس حاصل کی اور ساتھ ہی سنسکرت زبان اور ہندوستانی روایات، رسم ورواج پر عبور حاصل کیا۔ البیرونی کی زندگی کا ایک حصہ سندھ اور پنجاب میں گذرا، خصوصاً سندھ کے لوگوں سے گھل مل کر ان کے علوم حاصل کیے۔[۲]

البیرونی آزاد خیال مسلمان تھے، ہر مذہب کا احترام کرتے اور اس کے ماننے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مذہب میں جو خوبی نظر آتی تو اس کی تحسین کرتے اور کمیوں کی نشاندہی کرتے، عقیدے کے موافق سنی تھے لیکن ان کی طبیعت کا جھکاؤ شیعیت کی طرف زیادہ تھا اہل عرب سے ان کو زیادہ رنج تھا کیونکہ عربوں نے ساسانیوں کے جاہ وجلال کو مجروح کیا تھا اس کے برخلاف ایرانیوں سے یا جو چیزیں ایران سے تعلق رکھتی تھیں ان سے بے حد لگاؤ تھا۔ البیرونی کے بچپن میں خوارزم کے اندر سامانیوں کی حکومت تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی حکومت کمزور ہوتی گئی، خوارزم کے قریب صوبہ جرجان تھا جہاں شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کی حکومت تھی۔ البیرونی اس سے وابستہ ہوئے اور کئی کتابیں تصنیف کیں جس میں مشہور ومعروف تصنیف شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے نام پر ہے۔ امیر قابوس کے مزاج میں سختی ہونے کی وجہ سے البیرونی دل برداشتہ ہو کر اپنے وطن خوارزم واپس آگئے جہاں ان کی ملاقات شیخ بو علی سینا سے ہوئی۔ یہاں علی بن مامون کی حکومت تھی جو علم شناس تھا علی بن مامون کے انتقال کے بعد سلطان محمود غزنوی نے خوارزم پر قبضہ کرلیا۔ اس درمیان جنگوں میں اور پھر فتح خوارزم میں جو خونریزی ہوئی البیرونی نے اپنی نظروں سے دیکھا۔ سلطان محمود غزنوی خوارزم کو فتح کرنے کے بعد خوارزم دربار کے تمام علماء فضلاء کو اپنے ساتھ غزنہ لے آیا جس میں ابوریحان البیرونی بھی شامل تھے۔ سلطان محمود غزنوی بہت بڑا علم پرور تھا، ہندوستان پر حملہ کے وقت محمود نے البیرونی کو اپنے ساتھ رکھا۔ بعد میں البیرونی نے ہندوستان میں سکونت اختیار کرلی۔ البیرونی نے زیادہ

---

[۲] ابوریحان البیرونی، سید سعید احمد، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی، سن طباعت ندارد، ص ۷۔۹
https://www.rekhta.org/ebooks/abu-rayhan-al-biruni-syed-saeed-ahmad-ebooks?lang=ur

وقت اجمیر میں گزارا جہاں ہندوؤں کی عبادت گاہ تھی اور ہندوستان کے مشہور پنڈت اور ہندو عالم رہتے تھے۔اس شہر میں ان کو ہندوستانی علوم وفنون کی بہت سی کتابیں دستیاب تھیں اس وجہ سے انہوں نے اجمیر میں قیام کیا لیکن ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی برابر آنا جانا لگا رہا جہاں انہوں نے ہندوؤں سے میل جول بڑھایا اور ہندوستانی تہذیب وتمدن، رہن سہن، عقیدہ ومذہب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ سنسکرت زبان پر گرفت مضبوط کر کے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں وید، پران، رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، منوسمرتی، برہمن سدھانت، پتانجلی، کبلا کی سنکھیا اور دیگر تحریروں کا مطالعہ کیا اور اپنے ذاتی تجربہ وحاصل بحث کو قلم بند کیا۔ جن حالات میں انہوں نے یہ علم حاصل کیا اس وقت ہندوؤں کے قریب جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔[3]

ہندوستان میں البیرونی کا علمی سفر آسان نہیں تھا اس لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں جاتے وہاں خود تعلیم دینا شروع کر دیتے وہ ہندوؤں کو یونانی علوم کی تعلیم دیتے۔ آہستہ آہستہ شاگردوں کا ہجوم بڑھنے لگا تو وہ جس مقام پر بھی جاتے تو وہاں ان کا پرزور استقبال کیا جاتا اور علمی مباحث کو بڑے غور سے سنا جاتا۔ ان کو ہندوستان میں ''ودیا ساگر'' یعنی علم کے سمندر کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس مقبولیت کے بعد انہوں نے ہندو علوم کو سیکھنا شروع کیا۔ جلد ہی انہوں نے مذہبی علوم اور سنسکرت میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ بھگوت گیتا کو عربی میں منتقل کر دیا۔ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کے اندر جو سکہ رائج کیا تھا اس میں البیرونی نے عربی کے ساتھ سنسکرت کا بھی استعمال کروایا تھا۔[4]

ہندوستان ہو یا غزنہ، ان کے علمی مشاغل میں وقت کے ساتھ علمی مصروفیات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ البیرونی نے حصول علم کے لیے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ البیرونی کی تصنیفات کی تعداد تقریباً دو سو بتائی جاتی ہیں۔ ان کی کچھ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں: آثار باقیہ، تاریخ خوارزم، تاریخ دور سلطان محمود غزنوی، قانون مسعودی، کتاب الصیدلہ فی الطب، کتاب الہند۔

ذیل میں ہم کتاب الہند کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

البیرونی کی شاہکار تصنیف کتاب الہند سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہزار سال پہلے کے ہندوستان

---

[3] ماخذ سابق ص ۲۰۔۲۱

[4] ماخذ سابق ص ۲۳

اور آج کے ہندوستان میں رہن سہن، اور معاشرت کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی یا نہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ حقیقتاً البیرونی نے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے کتاب کے دیباچے میں لکھا کہ:

بیرونی نے اپنی کتاب کا آغاز ہی اس سچے قول سے کیا ہے کہ ایک دوسرے کو نہ جاننے سے بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہندوؤں کے صحیح صحیح حالات نہ معلوم ہو سکے۔ لیکن ان کو جان لینے سے وہ چیز (جس کا سمجھنا مشکل تھا) آسان ہو جائے گی یا اس کے نہ سمجھ سکنے کا سبب معلوم ہو جائے گا۔ اس لیے کہ بے تعلقی کی حالت میں جو چیز نہیں معلوم ہو سکتی وہ میل جول کی حالت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنے اس قول پر پورا عمل کیا اور ہندوؤں اور ان کے علوم اور رسم و رواج کے جاننے کی کوشش اس محنت اور جانفشانی سے کی کہ کسی غیر ملک والے نے نہ کبھی اس سے قبل کی تھی اور نہ اس کے بعد کسی کو توفیق ہوئی۔ وہ ان تمام مشکلات پر غالب آیا جن کا سر کرنا ناممکن اور محال معلوم ہوتا تھا[5]۔

البیرونی نے بتایا کہ ہندوؤں سے علم حاصل کرنا کتنا بڑا چیلنج تھا، جس کے وہ کئی اسباب بیان کرتے ہیں۔ (۱) مسلمان ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تھے اور ہندوؤں کے علاقے پر قبضہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں سے خوف کھاتے تھے حتیٰ کہ ان کے قریب آنے سے بھی ہچکتے تھے اور ہر لمحہ اس بات کے لیے متفکر رہتے تھے کہ کب اور کس وقت کس ہندو کی شامت آجائے۔ وہ اپنے آل و اولاد و خاندان والوں کو مسلمانوں کے طور طریقے سے بھی خوفزدہ کرتے تھے۔ (۲) ہندو قوم خود کو مقدس اور پاک تصور کرتی تھی جب کہ مسلمانوں کو ناپاک خیال کرتی تھی اسی لیے ان کو پاس بیٹھانا یا باتیں کرنا بھی گناہ سمجھتی تھی۔ (۳) ہندوؤں کے علوم سنسکرت میں ہونے کی وجہ سے ان کا سیکھنا مشکل تھا کیونکہ سنسکرت زبان کا سیکھنا ہی بہت دشوار کام تصور کیا جاتا تھا۔ (۴) مسلمانوں کی فتوحات کی وجہ سے ہندوؤں کی متحدہ جمیعت کا نظم بکھر چکا تھا اور وہ بھاگ بھاگ کر مختلف جگہوں پر اقامت اختیار کر رہے تھے اور اپنے ساتھ مذہبی کتب و دیگر چیزیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ انہوں نے مذہبی مرکز اقتدار کو مغرب سے مشرقی ہند منتقل کر دیا۔ ان کی مذہبی کتاب اکثر و بیشتر شعر کی صورت میں تھی جس کی تفہیم آسان کام نہ تھا۔ (۵) ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندو ہر غیر ملکی یا اجنبی چیز کو کمتر سمجھتے تھے کہ ملک تو ان کا ملک، انسان

---

[5] کتاب الہند، البیرونی، مترجم سید اصغر علی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۴۱، دیباچہ، ج ا صفحہ: ز۔

ہیں تو ان کی قوم کے لوگ، بادشاہ تو ان کا بادشاہ، دین ہے تو وہ جو ان کا مذہب ہے اور علم ہے تو وہ جو ان کے پاس ہے۔[۶]

کتاب الہند میں ابواب بندی کا خاص اہتمام کیا گیا۔ ہر باب تمہید سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد عموماً تین اجزا میں بحث آتی ہے، پہلے اس عنوان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں پھر اس کی تفصیل سے وضاحت کرتے ہیں اور آخر میں مستند مصنفین ہند و یونانی فلسفیوں اور سنتوں کی کتابوں سے اقتباسات درج کرکے اپنی تحریر میں مضبوطی لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں جابجا نقد اور مقابلہ سے بھی مدد لینے کی کوشش ہے۔ اس ترتیب کا البیرونی نے تقریباً ہر باب میں خیال رکھا ہے۔ اس کتاب میں جامعیت کے ساتھ اختصار کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ انہوں نے سنسکرت ادب سے بحث کے ساتھ بہت سی ہندو مذہبی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کتابوں کے مواد سے متعلق انتخابات بھی دیے ہیں۔ رامائن، مہابھارت اور منو دھرم کے کثرت سے اقتباسات کتاب الہند میں پائے جاتے ہیں۔

اس کتاب میں البیرونی نے ہندوستان میں رہتے ہوئے براہ راست تجربہ کا ذکر کیا ہے، کتاب کی اشاعت غزنہ میں ہوئی لیکن اس کا خاکہ اجمیر میں تیار ہوا تھا۔ اس کتاب کی عظمت و مقبولیت میں آج تک کوئی کمی نہیں ہے اور ہر زمانے میں محققین کے لیے تحقیق کا سامان موجود ہے۔ کتاب کا نام "کتاب ابی الریحان محمد بن احمد البیرونی فی تحقیق ماالھند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل ومرذولہ" اس کتاب کا اردو ترجمہ سید اصغر علی نے کیا اور نظر ثانی مولوی سید عطا حسین نے کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے ۱۹۴۱ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خواہش پر منظر عام پر آئی، مولوی عبدالحق کا دس صفحے کا طویل دیباچہ ہے جس میں البیرونی کی شخصیت اور کتاب الہند کا نچوڑ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری کے سامنے البیرونی و کتاب الہند کا مکمل خاکہ سامنے آجائے۔ جلد اول میں ۳۰ ابواب ہیں جو ۴۱۷ صفحات پر مشتمل ہیں۔ کتاب کی ابتدا ہندوؤں کے معبودوں سے کی ہے۔ اس باب میں البیرونی نے پاتنجلی سے ایک مکالمہ بیان کیا ہے جو سوال و جواب پر مبنی ہے اس کے بعد ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''گیتا'' سے وضاحت کی ہے اور اس باب کا آخری ذیلی عنوان ہے ''ہندو عوام کے عقائد بہت مختلف اور خلاف عقل ہیں دوسرے دینوں میں بھی اس قسم کے اقوال موجود ہیں۔ اسلام میں بھی ایسے اقوال موجود ہو گئے ہیں'' اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تیسرے باب میں پہلے یونانی، صوفی لفظ کی تحقیق ہے

---

[۶] ماخذ سابق ص ۲۰-۳۱

جو جالینوس، افلاطون کے اس قول پر کہ فرشتوں یا دیوتاؤں کو موت کیوں نہیں آتی ہے، بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح پانچواں باب ارواح کی حالت اور تناسخ سے متعلق بحث پر مبنی ہے جس میں البیرونی نے بتایا کہ "تناسخ کا عقیدہ" ہندو مذہب کا امتیاز ہے جو شخص تناسخ کا قائل نہیں ہے وہ ہندو نہیں ہے اور اس کا شمار ہندوؤں میں نہیں ہو سکتا۔[7]

باب ششم میں موت کے بعد کی زندگی پر بحث ہے۔ جنت، جہنم اور درمیانی طبقہ، جہنم کے طبقات اور مختلف گناہوں کے لیے طبقات متعین کیسے گئے ہیں اور جنت یا ثواب و عذاب کے مسئلہ میں صوفی اور ہندوؤں کے عقائد پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ساتویں باب میں دنیا سے نجات پانے کا طریقہ ہے اور گیتا، پاتنجلی اور صوفیوں کے طریقہ عمل پر بات کی ہے جس کے اندر ہندو عقیدے کا نظریہ، یونانی فلاسفر فیثاغورث و سقراط کے نظریات کا ابو بکر و بایزید بسطامی کے نظریات سے موازنہ کیا ہے۔ البیرونی نے مختلف ابواب میں ہندوؤں کی صحیح تصویر سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ انسان کے مرتبوں کی قسموں کو بیان کیا ہے اس میں برہما، نارائن اور مہادیو شنکر کے قول کو نقل کیا ہے اور دیو یا فرشتوں کے تعلق سے یونانیوں کے اقوال ہندوؤں سے کتنے میل جول کھاتے ہیں اس پر وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد ہندوؤں کی چار ذاتوں کے متعلق برہمن، کشتر، بیش (ویش) چوتھا اور آخری طبقہ شدر کے تعلق سے بحث کی ہے۔ اگلے باب کی زیادہ تر بات مہابھارت اور عرب جاہلیت سے پہلے وہاں کے رسم و رواج پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ جس طرح پانڈو کے چاروں بیٹوں کی ایک مشترک جورو تھی جاہلیت عرب میں بھی اسی کے مماثل رواج تھا۔ یہ باب ہندو مذاہب و قوانین پر مبنی ہے۔ گیارہویں باب میں بت پرستی کی ابتدا اور اس کے اقسام پر بحث کی ہے۔ بارہویں باب میں بید، پُران، سمرتی اور کتاب مہابھارت اور اس کی عظمت کے بارے میں گفتگو ہے، پھر مہابھارت کے اٹھارہ حصوں پر اجمالی گفتگو کی گئی ہے، مہابھارت کے متعلق البیرونی لکھتے ہیں "ہندوؤں کے پاس ایک کتاب ہے جس کی عظمت ان لوگوں میں اس درجہ ہے کہ ان کا قطعی فیصلہ ہے کہ جو کچھ دوسری کتابوں میں ہے وہ سب اس میں یقیناً موجود ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ کسی دوسری کتاب میں موجود نہیں ہے[8]۔"

چودہواں باب ہندوستانی فلکیات، نجوم، طب اور شگون و فال کے لیے مختص ہے۔ ان علوم پر جو

---

[7] ماخذ سابق ص ۴۵

[8] ماخذ سابق ص ۱۷۴۔۱۷۵

کتابیں موجود ہیں ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ ”ان کے علاوہ اور بھی بہتیرے دوسرے علوم وفنون کی بے شمار کتابیں ہیں لیکن ہم ان سے واقف نہیں ہو سکے“[۹]۔

پندرہویں باب میں وزن کرنے کا طریقہ، دوسرے رائج طریقوں سے اس کا موازنہ کیا گیا ہے۔ سولہویں باب میں حروف تہجی، رسم وخط کے بیان میں لکھا ہے کہ ہندو لکھنے کے لیے کون سے پتوں کا استعمال کرتے تھے، عجیب رسموں کے متعلق لکھتے ہیں ”مصافحہ میں ہاتھ کو پشت دست کی طرف سے پکڑتے ہیں۔ گھر کے اندر آنے کے لیے اجازت نہیں طلب کرتے اور باہر بغیر اجازت کے نہیں جاتے۔ مجلسوں میں چار زانو بیٹھتے ہیں۔ بغیر بڑوں کے ادب کے تھوک چھینکتے رہتے ہیں اور ان کے سامنے جوں مارتے رہتے ہیں ریاح خارج ہونے کو مبارک اور چھینک کو منحوس سمجھتے ہیں“[۱۰]۔

اٹھارہویں باب میں شہر، پہاڑ، دریا اور سمندر ان سب کے درمیان فاصلے نیز ان کے حدود کے متعلق معلومات کو جمع کیا ہے۔ انیسویں باب میں ستاروں کی باتیں ہیں، آفتاب کے بارہ نام گنوائے ہیں بروج کے نام ان کی صورتیں اور چاند اور اس کی منزلوں پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اکیسویں باب میں زمین کے طبقات ان کی ترتیب، جزیروں، سمندروں کے نام اور پرانوں پر مبنی نقشہ جات کو کتاب میں پیش کیا ہے۔ تیسویں باب میں میرو پہاڑ اس کی گرہیں وراس کے ارد گرد جو بڑے بڑے پہاڑ ہیں ان پر بحث کی ہے۔ چوبیسویں باب میں پرانوں کے مطابق سات جزائر پر بحث کی ہے۔ پچیسویں باب میں دریاؤں کے سرچشمے اور وہ کن راستوں سے نکلتے ہیں اور کہاں جاکر گرتے ہیں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ چھبیسویں باب میں ہندو ماہرین فلکیات کے مطابق آسمان وزمین کی صورت کو بیان کیا ہے۔ اتیسویں باب میں مصنف نے ہندو کے نزدیک زمین کی حدبندی کہا ہے؟، یا شہروں کے نام بدلنے کے اسباب اور ان شہروں کے نام کی فہرست بھی دی ہے جو کچھوے کی صورت میں ہے۔ جلد اول کا آخری باب ” لنکا جو زمین کا گنبد مشہور ہے“ اس میں گنبد کا مفہوم، راون کا قلعے کا نقشہ، رام کا لنکا پہنچنا، کتاب رام ورامائن اور چیچک کی نسبت ہندوؤں کا عقیدہ اور اس کے علاج پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

دوسری جلد باب ۳۱ سے شروع ہوئی ہے اور باب ۸۰ پر اس کا اختتام ہوا ہے۔ اس جلد میں کل ۵۰ ابواب ہیں جو ۴۴۱ صفحات پر محیط ہیں۔ اس میں ملکوں کے درمیان فاصلے، یوم کے اقسام اور دن رات کا

---

[۹] ماخذ سابق ص ۲۰۸

[۱۰] ماخذ سابق ص ۲۴۲

بیان، مہینوں اور سالوں کی قسمیں، مہینہ اور سال کے اجزا کا بیان، باسیدیو اور بھارت کی لڑائی کا ذکر، اکشوہنی (فوجی نظام) کا بیان، کواکب کی ترتیب، فاصلے، ماہتاب کی منزل اور سورج وچاند گرہن کا بیان ہے، وہ چیزیں جو برہمن کے لیے خاص ہیں اور زندگی میں کرنا ان پر واجب ہے اور غیر برہمن پر ان رسومات کی پابندی ان کی زندگی میں لازم وملزوم ہیں۔ یہ سب بھی موجود ہیں، پھر قربانی کا بیان ہے اور قابل تعظیم مقامات کی زیارت، کھانے پینے کی حلال وحرام چیزیں، نکاح، حیض، جنین اور نفاس، ان سب معاملات میں ہندوؤں کے طرف سے کیا رہنمائی کی گئی ہے اس کو واضح کیا ہے۔ سزاؤں اور کفاروں کے بیان میں زانیہ عورت کی سزا یہ ہے کہ اپنے شوہر کے گھر سے نکال دی جاتی ہے اور جلاوطن کردی جاتی ہے۔ میراث اور اس میں میت کے حقوق، میراث کے متعلق ہندوؤں کا اصول بیٹی کے سوا اور سب عورتوں کو محروم کردیتا ہے۔ روزہ اور اس کی قسمیں، روزے کے دنوں کا تعین۔ ہندوؤں کے نزدیک کوئی روزہ فرض نہیں ہے بلکہ سارے روزے نفل و مستحب ہے۔ عیدین وخوشی کا دن کے متعلق البیرونی فرماتے ہیں کہ ''چیت کا دوسرا دن اہل کشمیر کا عید کا دن ہے جس کا نام اگدوس ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان کے راجہ مُتی نے ترکوں پر اس روز فتح پائی۔ ان کے نزدیک یہ راجہ ساری دنیا کا بادشاہ تھا''[۱۱]۔ ۱۲ مہینوں میں کون سا دن خوشی کا ہے یا ہندوؤں کے نزدیک اس کی کیا عظمت ہے اس کو واضح کیا ہے۔ واجب التعظیم ایام اور مبارک و منحوس وقت جو ثواب حاصل کرنے کے لیے مقرر ہیں، ستاروں کے احکام کے متعلق ہندوؤں کے اصول۔ ان سب عنوانات کے تحت البیرونی نے دوسری جلد میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ کتاب کے آخر میں البیرونی لکھتے ہیں:

> جس قدر ہم نے بیان کیا وہ اس شخص کے لیے جو ہندوؤں سے بحث و گفتگو کرنا، اور ان کے حالات وخیالات کی حقیقت سے واقف ہو کر ان سے سوال وجواب کرنا چاہے کافی ہے۔ اب ہم اس کتاب کو جو اس قدر لمبی چوڑی ہو گئی ہے کہ پڑھنے والے گھبرا جائیں ختم کرتے ہیں اور ان باتوں کو نقل کرنے کی جو حق نہیں ہیں اللہ سے معافی مانگتے ہیں اور اس چیز پر مضبوطی سے قائم رہنے کی جس سے وہ راضی ہو توفیق طلب کرتے اور باطل سے واقف ہونے کی ہدایت چاہتے ہیں تاکہ اس سے بچے رہیں۔ بھلائی اسی کی طرف سے ہے اور وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے''[۱۲]۔

---

[۱۱] کتاب الہند، البیرونی، مترجم سید اصغر علی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۴۱، ج ۲، ص ۵۶۳

[۱۲] ماخذ سابق، ص ۴۴۰

یہ کہنا حق بجانب ہے کہ البیرونی نے اپنی کتاب میں دوسرے ادیان کے عقائد، رسوم، رواج اور تہواروں کو ایمانداری اور بغیر تعصب کے پیش کردیا تاکہ ہر دین کی پہچان آسان ہوجائے۔ دین کے بارے میں اس کا نظریہ عصبیت سے پاک تھا، اس نے جملہ ادیان کو جیسا سمجھا اور پرکھا ان کو ویسا ہی پیش کردیا۔

خلاصہ: آج کے دور میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ تعددی معاشرے کے تقاضوں کو سمجھا جائے۔ اور بین المذاہب بقائے باہم کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ مذاہب کا مطالعہ اس انداز سے کیا جائے کہ امن ومحبت کی فضا قائم ہو۔ دور حاضر میں سماج کے اندر مذہب کی بنیاد پر جو زہر گھولا جارہا ہے وہ بڑا کرب ناک ہے اگرچہ ایسے لوگ گنتی کے ہیں لیکن سوشل میڈیا اور دیگر وسائل کی فراہمی کی وجہ سے یہ سماج میں حاوی ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے مذہب کے سوا کسی اور مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنے مذہب کی تبلیغ تعلیمات کی بنیاد پر فروغ حاصل کررہے ہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ جبر، طاقت اور دوسروں کی مجبوری اور کمزوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کچھ شر پسند عناصر امن کے ماحول کو خراب کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو عام کیا جائے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب (بالخصوص ہندوستان میں ہندو) کے درمیان جو خلیج بڑھتی جارہی ہے اس کو کم کرنے کی ضرورت ہے۔ البیرونی کی یہ کتاب اسلام اور تعددیت کو سمجھنے کے لیے نمونہ ہے۔

غبار خاطر اور خطوط غالب کے مشترکہ عناصر

ڈاکٹر مشیر احمد

شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

dr.musheer1978@gmail.com

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے تین مجموعے کاروان خیال، نقش آزاد اور غبار خاطر ہیں۔اول الذکر دونوں مجموعوں کے خطوط کی نوعیت مؤخرالذکر مجموعہ سے مختلف ہے۔کاروان خیال اور نقش آزاد کے بیشتر خطوط دراصل علمی،کاروباری اور ذاتی نوعیت کے ہیں۔بہ الفاظ دیگر یہ خطوط کسی نہ کسی خارجی ضرورت کے تحت لکھے گئے ہیں،دوسرے ان خطوط کے خاص مکتوب الیہ ہیں اور تیسرے یہ خطوط باقاعدہ طور پر مکتوب الیہ تک بذریعہ ڈاک بھیجے بھی گئے ہیں۔اس لیے ان خطوط میں خط کا عام لہجہ اور انداز ملتا ہے۔مثلاً مکتوب الیہ کی خیر وعافیت دریافت کرنا یا اپنی خیریت سے مکتوب الیہ کو آگاہ کرنا اور سلام وپیام وغیرہ سارے رسوم ان خطوط میں موجود ہیں۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان خطوط میں لطف وانبساط کا کوئی سامان موجود نہیں ہے،نہ ہی مولانا آزاد کی شخصیت کے نقوش ابھرتے ہیں اور نہ ہی ان کا مخصوص اسلوب سامنے آتا ہے۔

جہاں تک غبار خاطر کا تعلق ہے تو یہ خطوط فنی اعتبار سے مولانا آزاد کی فن کاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔اس مجموعہ کے خطوط اس وقت ضبط تحریر میں لائے گئے،جب وہ قلعہ احمد نگر میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے،دوسرے یہ خطوط مولانا آزاد نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ''صدیق مکرم'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔غبار خاطر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''صدیق مکرم'' کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا۔تیسرے یہ خطوط مجموعی طور پر اور اشاعت کے بعد مکتوب الیہ کے سپرد کیے گئے۔جس کی وضاحت مولانا آزاد کے اس خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے ۳؍ ستمبر ۱۹۴۵ کو نسیم باغ، سرینگر سے لکھا تھا۔خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

> ۱۵؍ جون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیبِ تاریخ جمع کر دیے۔خیال تھا کہ انھیں حسب معمول نقل کرنے کے لیے دے دوں گا اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا، لیکن جب مولوی اجمل خان صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مصر ہوئے کہ انھیں بلا تاخیر اشاعت کے لیے دے دینا چاہیے۔چنانچہ ایک خوشنویس کو

شملہ میں بلایا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے اور امید ہے کہ عنقریب طباعت کے لیے پریس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اب میں ان مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا، مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا۔[1]

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۰/ اگست ۱۹۴۲ سے ۱۵/ جون ۱۹۴۵ تک جیل میں رہے۔ ابتدا میں احمد نگر کے قلعہ میں قید رہے اور آخری ڈھائی مہینے احمد نگر قلعہ سے بانکوڑا جیل میں رہے، جیسا کہ مذکورہ بالا خط سے معلوم ہوتا ہے۔

غبار خاطر میں کل ۲۴ خطوط ہیں۔ ابتدائی تین خطوط رہائی کے بعد کے ہیں، جن میں پہلا خط ۲۷/ جون ۱۹۴۵ کو شملہ سے لکھا گیا ہے۔ دوسرا خط ۲۴/ اگست ۱۹۴۵ کو ہاؤس بوٹ سرینگر سے اور تیسرا خط ۳/ ستمبر ۱۹۴۵ کو نسیم باغ سرینگر سے لکھا گیا ہے۔ ایک خط گرفتاری سے قبل ۳/ اگست ۱۹۴۲ کا تحریر کردہ ہے، جو مولانا نے بمبئی جیل (براہ ناگپور) میں لکھا ہے۔ یہ خط ۹/ اگست ۱۹۴۲ کی گرفتاری کی وجہ سے بھیجا نہ جا سکا تھا۔ قید خانہ سے مولانا آزاد کا لکھا ہوا پہلا خط ۱۰/ اگست ۱۹۴۲ کا ہے اور آخری خط ۱۶/ ستمبر ۱۹۴۳ کا لکھا ہوا ہے۔ ان خطوط کی مجموعی تعداد ۲۰ ہے۔

غبار خاطر کی اہمیت وافادیت اس لیے بھی ہے کہ اس کی روشنی میں مولانا آزاد کی سوانح مرتب کی جا سکتی ہے۔ یعنی اس میں خود سوانحی عناصر جابہ جا موجود ہیں۔ مثلاً ان کی زندگی کی رنگارنگ تصویر، خاندانی حالات و واقعات، ابتدائی زندگی کے بہت سارے واقعات و حادثات پورے شدومد کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس کتاب میں تاریخی مسائل و مباحث کی تفصیل موجود ہے۔ غبار خاطر کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو تاریخ سے گہرا شغف تھا۔ بیشتر خطوط اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ مثلاً جہاں انھوں نے قلعہ احمد نگر کی تاریخ بیان کی ہے، چائے اور موسیقی سے ذہنی وفطری مناسبت اور لگاؤ کی بنیاد پر ان کی پوری تاریخ اور تفصیل پیش کی ہے، جس سے چائے اور موسیقی سے متعلق اہم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں طنزومزاح سے متعلق بھی بعض تحریریں نظر آتی ہیں۔ فلسفیانہ مباحث کی اگر بات کی جائے تو دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ اور حیات وکائنات کا فلسفہ بھی غبار خاطر میں بیان ہوا ہے۔ زبان وبیان کی سادگی ودلکشی، منظر نگاری، ڈرامائی عناصر وغیرہ جیسے بے شمار مسائل ومباحث غبار خاطر میں بھرے پڑے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں غبار خاطر اور

---

[1] ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۱۴ء ص ۹

غالب کے خطوط میں مشترک پہلوؤں اور گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

غبار خاطر کے جن امور کی نشاندہی سطور بالا میں کی گئی ہے کم و بیش وہی مباحث خطوط غالب میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً تاریخی، سوانحی، طنز و مزاح اور حکمت و دانائی و فلسفہ وغیرہ جیسے امور و مباحث دونوں کے یہاں مشترک ہیں۔

مولانا آزاد نے تاریخ سے دلچسپی کے سبب اپنے خطوط میں قلعہ احمد نگر کی مفصل تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ موسیقی اور چائے کے تعلق سے نہایت دلچسپ اور اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ غالب کے خطوط اس دور کی تاریخی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے آئینہ دار ہیں۔ اس زمانے کی دلی ہمیں غالب کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ ۱۸۵۷ سے پہلے کی دلی اور اس کے بعد دلی کی صورت حال کیا تھی اس کا اندازہ غالب کے خطوط سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اب دونوں خطوط کے مجموعوں کی روشنی میں بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد قلعہ احمد نگر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ شہر بھی ہندوستان کے ان خاص مقامات میں سے ہے، جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرہویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی، تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے علم استقلال بلند کیا اور بھنگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت یہی مقام بن گیا۔۔۔ ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اول نے اسے منہدم کرکے از سر نو پتھر کا حصار تعمیر کیا اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ ۱۸۰۳ کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا، پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔۔۔ یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا۔۔۔ اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خان خاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا، جس کی سرگذشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے

ہمیں سنائی جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خان خاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا۔[۲]

غالب، نواب علاء الدین خاں علائی کے نام اپنے ایک خط (مرقومہ ۱۶، فروری ۱۸۶۲) میں دلی کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کنپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔[۳]

اسی سلسلے کے خط کا ایک حصہ اور ملاحظہ فرمائیں:

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روزہ بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔[۴]

مولانا آزاد اور غالب دونوں کے یہاں تاریخی واقعات کے ذیل میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مولانا آزاد نے قلعہ احمد نگر کی جو تاریخی صورت حال بیان کی ہے اس کی حیثیت جغرافیائی ہے۔ غالب کے یہاں صورت بالکل مختلف ہے، یہاں غالب دلی کی جغرافیائی تاریخ نہیں بیان کر رہے ہیں بلکہ ۱۸۵۷ کے بعد دہلی کی صورت حال بیان کر رہے ہیں۔

سوانحی عنصر کا جہاں تک تعلق ہے تو غبار خاطر اور خطوط غالب دونوں سے بالترتیب مولانا آزاد اور غالب کی سوانح مرتب کی جاسکتی ہے۔ مثلاً مولانا آزاد اپنے بچپن، لڑکپن کا ذکر کرتے ہوئے غبار خاطر میں لکھتے ہیں:

---

[۲] ماخذ سابق، ص ۲۶

[۳] خلیق انجم غالب کے خطوط جلد دوم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۲۰۰۰، ص ۳۸۳

[۴] ماخذ سابق، مکتوب بنام میر مہدی مجروح مرقومہ ۲/دسمبر ۱۸۵۹، ص ۵۱۴

لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا، جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے۔ اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے، اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں، اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بینچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں، اب یہ جھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا، تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ میں بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔[5]

خاندانی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی، جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا۔ اس لیے خلقت کا جو ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے مذہبی عقید تمندوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔۔۔ میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدتمندانہ پرستاروں سے خوش نہیں ہوتا تھا، بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کمیاب جنس ڈھونڈتے ہیں، اور ملتی نہیں، مجھے گھر بیٹھے ملی اور میں اس کا قدر شناس نہ ہو سکا۔[6]

غالب نے بھی اپنے خطوط میں جابہ جا اپنے خاندانی حالات، زندگی کے اہم نقوش کہیں عام حالات میں اور کہیں طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کیے ہیں اور تاہل کی زندگی بھی ان کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ علائی کے نام لکھے گئے اپنے ایک خط میں غالب نے استعاراتی انداز میں اپنی مکمل زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے اور اہل و عیال کا ذکر بھی کیا ہے۔ جون ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں غالب نواب علاءالدین خاں علائی کو لکھتے ہیں:

سنو عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے، جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم اور پھر آپ جواب دیتا ہے للہ الواحد القہّار۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ

---

[5] غبار خاطر ص ۸۰

[6] ماخذ سابق، ص ۸۲

عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۷، رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقّت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیّہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی، طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا، کچھ کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا، بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہ ہر تقدیر، بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔[۷]

غبار خاطر میں بعض مقامات پر طنز و مزاح کے نمونے بھی نظر آتے ہیں اور غالب کے یہاں تو اس کی افراط ہے۔ غالب کے بارے میں حالی نے لکھا ہے کہ ظرافت ان کے مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ غالب کے یہاں حسن بیان، حاضر جوابی اور بات سے بات پیدا کرنے کا انوکھا اور نرالا انداز ملتا ہے۔ عام حالات کے علاوہ سنجیدہ معاملات میں بھی وہ ہنسی مذاق کا پہلو نکال لیتے تھے۔ غالب کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے دوسروں کو تو کم اپنے آپ کو زیادہ طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ آئندہ سطور میں غبار خاطر اور خطوط غالب سے طنز و مزاح کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے قلعہ احمد نگر پہنچنے کے بعد وہاں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

یہاں پہنچنے کے بعد چند دنوں تک تو صرف جیلر ہی سے سابقہ رہا۔ ایک دو مرتبہ کلکٹر اور سول سرجن بھی آئے۔ پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا، اسی دن ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا آئی ایم ایس سے تعلق رکھتا ہے۔ میجر ایم سینڈک نام ہے، اور یہاں کے لیے سپرنٹنڈنٹ

---

۷ خلیق انجم، غالب کے خطوط، ص ۳۷۲

مقرر ہوا ہے۔ میں نے جی میں کہا یہ سینڈک، بینڈک کون کہے! کوئی اور نام ہونا چاہیے جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ معاً حافظہ نے یاد دلایا، کہیں نظر سے گذرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں اس قلعہ کا قلعہ دار چیتہ خان نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے ان حضرت کا نام چیتہ خاں ہی رکھ دیا۔[۸]

مولانا آزاد نے ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے، جو لطف سے خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

دوسرے دن صبح برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ بلبل کے ترانے کی آواز پھر اٹھی میں نے ایک صاحب کو توجہ دلائی کہ سننا بلبل کی آواز آرہی ہے۔ ایک دوسرے صاحب جو صحن میں ٹہل رہے تھے، کچھ دیر کے لیے رک گئے اور کان لگا کر سنتے رہے۔ پھر بولے کہ ہاں قلعہ میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے، اس کے پہیّوں کی آواز آرہی ہے۔ سبحان اللہ! ذوق سماع کی دقت امتیاز دیکھیے؛ بلبل کی نواؤں اور چھکڑے کے پہیّوں کی ریں ریں میں یہاں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔[۹]

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ غالب سنجیدہ سے سنجیدہ موقع پر بھی طنز و مزاح کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔ مرزا حاتم علی مہر سے غالب کی چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی، حاتم علی مہر کی محبوبہ کا انتقال ہو گیا۔ غالب نے ان کو جو تعزیتی خط لکھا ہے، ایک تو وہ بہت دلچسپ ہے، دوسرے اس میں حکیمانہ پہلو بھی نظر آتا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

جناب مرزا صاحب۔ آپ کا غم افزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا۔ یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی، تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی، تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی، کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے

---

[۸] غبار خاطر ص ۵۶

[۹] ماخذ سابق، ص: ۲۰۴

ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ بہ آں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مر نا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہو گی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔[10]

برسات کے موسم میں غالب کے مکان کی حالت کیسی تھی اس کا نقشہ بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں: ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔[11]

حیات و کائنات کی باریکیاں، دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری اور حکمت و فلسفہ و دانائی کی مثالیں غبار خاطر اور خطوط غالب دونوں جگہ موجود ہیں۔ پہلے غبار خاطر سے دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

غور و فکر کا ایک قدم اور بڑھایئے، تو خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت واضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے؟ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں، اگر چاہیں تو اسی کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے، زندہ ہے، آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔[12]

حکیمانہ و فلسفیانہ باتوں کی غبار خاطر میں کثرت ہے، قدم قدم پر قاری کو احساس ہوتا ہے کہ ہر دو چار صفحے کے بعد کوئی نہ کوئی نکتہ اس کے ذہن و دماغ کو روشن کر رہا ہے۔ غبار خاطر میں چڑیا چڑے کی کہانی سے ہم سب واقف ہیں، مولانا آزاد نے چڑیوں کی مناسبت سے ایسے ایسے نکات پیش کیے ہیں، جس سے ان کے پرندوں کے تعلق سے عمیق مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں انسانی زندگی کے بہت سے پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جس فلسفۂ خودی کی بات کی ہے وہی بات مولانا آزاد کے یہاں خود شناسی کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ انسان کو جب تک اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کا

---

[10] خلیق انجم غالب کے خطوط ص ۲۳۷

[11] غالب کے خطوط، ص ۳۹۸

[12] غبار خاطر ص ۴۵

احساس نہیں ہوتا اس وقت تک وہ احساس کمتری کا شکار رہتا ہے، اور تقدیر پر بھروسہ کیے بیٹھا رہتا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> اڑنے کے سروسامان میں سے کون سی چیز تھی جو اس نو گرفتارِ قفسِ حیات کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ فطرت نے سارا سروسامان مہیا کر کے اسے بھیجا تھا اور ماں کے اشارے دم بہ دم گرم پروازی کے لیے ابھار رہے تھے۔ لیکن جب تک اس کے اندر کی خود شناسی بیدار نہیں ہوئی اور اس حقیقت کا عرفان نہیں ہوا کہ وہ طائر بلند پرواز ہے، اس کے بال وپر کا سارا سروسامان بیکار رہا ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی خود شناسی بھی جب تک سوئی رہتی ہے، باہر کا کوئی ہنگامۂ سعی اسے بیدار نہیں کر سکتا۔ لیکن جو نہی اس کے اندر کا عرفان جاگ اٹھا اور اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی چھپی ہوئی حقیقت کیا ہے، تو پھر چشم زدن کے اندر سارا انقلابِ حال انجام پا جاتا ہے، اور ایک ہی جَست میں حضیض خاک سے اڑ کر رفعتِ افلاک تک پہنچ جاتا ہے۔[۱۳]

غالب کے خطوط کی اگر بات کی جائے تو وہ بھی مختلف الجہات ہیں۔ ان کے خطوط صرف سلاست و سادگی کا نمونہ نہیں اور نہ ہی ان میں صرف تاریخی، سماجی، سیاسی حالات بیان ہوئے ہیں یا پھر ان خطوط سے ان کی شخصیت کی جلوہ نمائی ہوتی ہے، بلکہ غالب کے خطوط میں بھی حکیمانہ و فلسفیانہ مباحث بکثرت آئے ہیں۔ ایک مثال یہاں نقل کی جا رہی ہے جس میں زندگی کی حقیقت اور دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بہت خوبصورت پیرائے میں کیا گیا ہے۔ یہ خط غالب نے اپنے چہیتے شاگرد مرزا ہر گوپال تفتہ کو لکھا ہے:

> تمہارے انتقالاتِ ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمھارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر دان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا! دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جیے تو کیا! کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں، شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت وراحت سے بھی گذر جاؤں، عالم بے

---

[۱۳] ماخذ سابق، ص ۲۳۲

رنگی میں گذر پاؤں۔ جس سنّاٹے میں، میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں، لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں؛ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے، ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا؟[۱۴]

یہاں اس بات کی وضاحت لازمی ہے کہ سطور بالا میں غبار خاطر اور خطوط غالب کے جن مشترکہ امور پر گفتگو کی گئی ہے، موضوعاتی سطح پر ان میں یکسانیت تو ہے، لیکن دونوں کی نوعیت بالکل منفرد ہے۔ دونوں کی تحریروں میں مشترک عناصر پر اگر تفصیلی گفتگو کی جائے تو یقیناً ایک حوالے کا کام ہوگا۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کی یہ ابتدائی کوشش ہے اور کوشش ہی کسی بڑے کام کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

[۱۴] غالب کے خطوط ص ۳۵۷

سید قطب کے تنقیدی نظریات

امتیاز احمد وانی

سلر پہلگام، کشمیر

waniimtiyaz731@gmail.com

مصری ناقد، ادیب اور مفسر سید قطب (۱۹۰۶ـ۱۹۶۶) دورِ جدید کے نامور عرب ادباء میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے علم و فن میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔انھوں نے مختلف تصانیف میں ادبی تنقید کے بعض اہم اصولوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ادبی تنقید کے میدان میں ان کی تین کتابیں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ان تینوں کتابوں کے مطالعے کے بعد ہمارے سامنے سید قطب کے تنقیدی افکار کے تین ارتقائی مراحل آتے ہیں۔ابتدائی مرحلے میں ان کی طالبِ علمی کا زمانہ شمار ہوتا ہے۔جس میں انھوں نےمهمة الشاعر فی الحیاة وشعر الجیل الحاضر لکھی۔یہ سید قطب کا سب سے پہلا سنجیدہ اور با مقصد تنقیدی عمل ہے۔اس کتاب میں آپ نے معروضی انداز میں شاعری اور شعراء کے سلسلہ میں اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کیا ہے اور جدید دور میں شاعری کی اہمیت پر عالمانہ بحث کی ہے۔

سید قطب کے نزدیک سب سے بہترین شعر وہ ہے جو شاعر کے اپنے اندرونی جذبات کی ترجمانی کرے۔شاعر کا زندگی کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہونا چاہیے۔عوام اور اس کے مابین تعلقات منقطع نہیں ہونا چاہیے۔شاعر کا کلام اس کے اور عوام کے احساسات و جذبات اور محسوسات کا آئینہ ہونا چاہیے۔وہ لکھتے ہیں :

> حقیقی شاعر تو وہی ہے جو زندگی کو گہرائی سے محسوس کرتا ہے اور شاعری سے زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔وہ وہی ہے جسے زندگی نے اس کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان واسطہ بننے کے لیے تشکیل دیا۔پس وہ ایک ممتاز شخصیت ہے۔کیونکہ زندگی نے اسے ایک خاص مثال کے مطابق ڈھالا تاکہ وہ اس کے لئے ایک ایسا خاص کام انجام دے سکے جسے ہر فرد انجام نہیں دے سکتا ہے۔
> اپنے کام کو مکمل طور پر انجام دینے کے لیے اس میں دو بنیادی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:
> پہلا: یہ کہ زندگی سے اس کا احساس اور تعلق عوام کی نسبت زیادہ درست اور گہرا ہو بشرطیکہ وہ اپنے اور عوام کے درمیان رابطہ منقطع نہ کرے تاکہ یہ احساس دوسرے انسانوں کے احساس سے واضح اور ممتاز ہو۔

دوسرا: جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اس کا ایسا اظہار کرنا جو سامعین کے تاثرات سے بلند ہو۔ اور جو کچھ اس نے دیکھا اور محسوس کیا اس سے متاثر ہوا ہو یعنی اپنے اندرونی جذبات واحساسات کی ترجمانی کر رہا ہو[1]۔

وہ شاعر کو فلسفی کے مقابلے میں زندگی کا حقیقی ترجمان قرار دیتے ہیں۔ فلسفی اور شاعر کے مقام کا تعین کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

جہاں تک فلسفی کا تعلق ہے، وہ زندگی سے دور جہاں تک اس کی فطرت اسے اجازت دیتی ہے اپنی جگہ بنالیتا ہے، اور وہ اوپر سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے، پھر اس کے تاثرات کو قلمبند کرتا ہے، اور اس کے مظاہر کو شمار کرتا ہے، اور وہ اس کا تصور اپنی سوچ اور فکر سے کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک شاعر کا تعلق ہے، وہ اپنے آپ کو زندگی میں غرق کرتا ہے، اس کے احساسات کو محسوس کرتا ہے، اس کی تلخی کو محسوس کرتا ہے، اس کے ساتھ تفاعل کرتا ہے، اور پھر اس کے بارے میں وہی بات کرتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے، یا جو زندگی اپنے بارے میں کہنا چاہتی ہے۔[2]

مهمة الشاعر في الحياة نامی کتاب میں سید قطب نے گمنام اور نوجوان شعراء کے کلام کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے بیان کردہ شاعر کے رول اور فکر کی وضاحت کی ہے۔ سید قطب نے اس خیال کو دہرایا ہے کہ ادب محض کیف وسرور حاصل کرنے کا ذریعہ اور زندگی کے مشکلات اور پریشانیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ شعر وادب میں عوام کے جذبات، اجتماعی وسیاسی حالات، اعلیٰ انسانی قدروں اور کائنا ت کی ترجمانی کرتا ہے۔

سید قطب ان شعراء کے کلام کا تذکرہ فخریہ انداز میں کرتے ہیں جن کے یہاں ان کو ملت و قوم کا درد، اور معاشرے کی اصلاح وتہذیب کا جذبہ نظر آتا ہے۔ جن شعراء کی سنجیدہ کوششوں کی انہوں نے ہمت افزائی کی ان میں خاص طور سے علی آفندی عبد العظیم، محمود عبد الرحمن محمود عماد اور عبد الرزاق عتیق، شامل ہیں۔ ان شعراء کو مد نظر رکھتے ہوئے شاعر کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

---

[1] سید قطب، مهمة الشاعر في الحياة وشعر الجيل الحاضر، دارالشروق، قاهره، ب ۔ ت، ص۲۱

[2] ماخذ سابق، ص۱۹-۱۸

شاعر کو مثل اعلی کے داعین میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ کیونکہ وہ دعوت کی تمام شکلوں کو اپناتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے انسانی ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے اور عوام کو زندگی کے تئیں فنکارانہ انداز میں زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا کرتا ہے۔[۳]

وہ مزید کہتے ہیں کہ نفسیاتی مطالعہ سے عیاں ہے کہ کوئی بھی انسان اس وقت تک کسی دوسرے کو متاثر نہیں کر سکتا جب تک وہ ایسی صاف و شفاف اور امتیازی حیثیت کا حامل نہ ہو جس کے وسیلے سے وہ دوسروں پر غالب آسکے۔

دوسرے مرحلے میں سید نے مصر کے ادبی رسائل و جرائد میں ادبی تنقید کے موضوعات لکھنے شروع کیے۔ ان رسائل و جرائد میں الرسالة، المقتطف، الثقافة، الاهرام، مجلة الاسبوع اور الكتاب قابل ذکر ہیں۔ آخری مرحلے میں انھوں نے النقد الادبی، اصوله ومناهجه لکھی۔ دوسرے مرحلے میں آپ کی مشہور تصنیف کتب وشخصیات منظر عام پر آئی۔ ۳۳۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سید قطب نے تیس سے زیادہ ان شخصیات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جنہوں نے شاعری، ناول نگاری، قصہ نگاری، تاریخ نویسی، اور مقالہ نگاری کے میدان میں خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ اپنی اس کتاب کو انھوں نے ان ہی سے منسوب کیا ہے۔ سید موصوف نے اس کتاب میں ان شعراء و ادباء کے غضب و رضا کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھیں ایک آئینہ دکھایا ہے تاکہ وہ شخصیات جنہوں نے اپنے فن کا حسین رخ دیکھا ہے وہ اس کے دوسرے رخ پر بھی نظر ڈالیں[۴]۔

اس کتاب کو سید قطب نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ تنقید کی اہمیت و افادیت اور اس کے اصول و قواعد پر بحث کرنے کے بعد پہلے باب میں ''فی عالم الشعر'' کے تحت ''الوعی فی الشعر''، ''النفس الا نسانية فی الشعرالعربی'' اور ''الطبيعة فی الشعر العربی'' جیسے اچھوتے اور دلکش موضوعات پر متوازن اور مدلل انداز مین روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے باب میں ''فی عالم القصة والرواية'' کے تحت انھوں نے گیارہ ادیبوں کے چودہ ناولوں اور قصوں کا تحلیلی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان میں طٰہٰ حسین کی علی هامش السيرة، أحلام شهرزاد اور شجرة البؤس، توفیق الحکیم کی الرباط المقدس، مازنی کی ابراهيم الثانی، عزیز اباظہ کی العباسة، خلیل ہنداوی کی

---

[۳] ماخذ سابق، ص ۱۰۷

[۴] سید قطب، کتب و شخصیات، دار الشروق القاهرة، ۱۹۸۳ء، ص ۳

سارق النار ، نجیب محفوظ کی خان الخلیلی قابل ذکر ہیں۔

تیسرے باب میں "فی النفس والعالم" کے تحت چار مؤلفین کی چار کتابوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

چوتھے باب میں "فی البحوث والدراسات" کے تحت چار ادباء کی چار کتابوں کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ ان میں عبدالقادر حمزہ کی "علی ھا مش التاریخ المصری القدیم" اور علی ادھم کی "بین الفلسفۃ والادب" قابل ذکر ہیں۔

آخری فصل میں "فی التراجم و التا ریخ" کے تحت دراسۃ الشخصیات بین العقاد وھیکل وطٰہٰ حسین، کے ضمن میں عقاد کا بحیثیت شاعر، غزل کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

عقاد کی شاعری اور ان کے دیوان اعاصیر مغرب کے تنقیدی مطالعے میں وہ لکھتے ہیں کہ عقاد بیدار مغز، روشن ضمیر اور باشعور شاعر ہے۔ ان کے یہاں احساس وشعور اور تصور کے نقوش پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ واضح ہے۔ عقاد کی شاعری کے چشموں کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''عقاد کی شاعری ان چشموں سے ابلتی ہے جن میں نفسیاتی کیفیات، فکری خیالات اور منطقی نظریات موجود ہیں۔[۵] شوقی کی مجنو ن لیلیٰ اور عزیزاباظہ کی قیس و لبنی کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے سید قطب کہتے ہیں کہ شوقی اپنی شاعری کی وجہ سے تو عزیز سے بڑے شاعر ہو سکتے ہیں، لیکن ان کی مجنون لیلیٰ فنی اعتبار سے قیس و لبنیٰ سے کم درجہ کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> اگر کوئی انسان ان دونوں شعری روایتوں کا ایک ہی وقت میں مطالعہ کرے گا تو ہر پہلو سے خواہ وہ کردار سازی ہو، واقعات کا ربط و تسلسل ہو یا فنی طریقہ تعبیر، اس کو ''قیس و لبنی'' میں فطری صداقت اور حرکت و زندگی نظر آئے گی جبکہ ''مجنون لیلیٰ'' میں موت کی خاموشی اور بے انتہا تصنّع کا احساس ہو گا۔ پہلی روایت میں روانی، سلاست اور قدرتِ ادا کا احساس ابھرتا ہے جبکہ دوسری روایت میں اضطرار اور عدم استحکام کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔[٦]

سید ناقدوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ دو ادبی تخلیقات کا تقابلی مطالعہ کرتے وقت کسی کی عظمت و شہرت کی بنیاد پر حکم صادر نہ کریں۔ وہ شوقی جیسے شعراء کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

۵ ماخذ سابق، ص ۸۴

٦ ماخذ سابق، ص ۱۴۰

جس غلطی کا ہم شوقی جیسے شاعر کی شعری کاوشوں اور ہم عصر شعراء وادباء کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے وقت ارتکاب کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم ان شعراء وادباء کی سابقہ شہرت سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ہم اپنی اس یاداشت پر اعتماد کر بیٹھتے ہیں جو ہمارے ذہنوں میں پہلے سے رچی بسی ہوتی ہے اور ان اوہام مقررہ پر یقین کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جدید ادباء کے مقابلے میں شہرت یافتہ ادباء کے ادبی کاوشوں کا فنی جائزہ لینے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔[۷]

ادبی نصوص کا مطالعہ کرتے وقت سید قطب تعصب اور جانبداری سے اوپر اُٹھ کر عدل واعتدال کا راستہ اختیار کرنے کے حق میں ہیں۔ ناقد کی نگاہ ہر شعر کے فنی محاسن تک پہنچنی چاہیے۔ ہر ایک کو اس کا واجبی مقام دلانے کی منصفانہ کوشش کرنی چاہیے۔

عقاد اور رافعی کے مابین ادبی معرکہ آرائی میں آپ نے اپنے چودہ تنقیدی مقالات پیش کئے جو آراء حرة بين العقاد والرافعی کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان دونوں ادباء کا مطالعہ کرتے ہوئے سید قطب کہتے ہیں کہ ان دونوں کا مسلک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ عقاد قوی الطبع اور فطرت سلیم کا ادیب ہے اور رافعی تند ذہنی اور فہم وذکا کا ادیب ہے۔ عقاد کا نفس کشادہ اور قلب تروتازگی کا مظہر ہے جبکہ رافعی کی شخصیت اس حیثیت سے بالکل خالی نظر آتی ہے۔ ان کے پاس صرف عقل ہے جو انسان کو محض چمک دمک دیتی ہے جبکہ عقاد کی نفسیاتی قوت رافعی سے زیادہ مستحکم ہے کیونکہ ان کے پاس علم وعقل دو نوں موجود ہیں۔

سید قطب عربی تنقید نگاری کے موجودہ اصول قواعد کو غیر اطمینان بخش قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ادبی تنقید نگاری کے سلسلے میں پہلا نقص یہ ہے کہ ہمارے یہاں نہ تو مطلوبہ اصول وقواعد ہیں اور نہ کوئی ایسا طریقہ جس کی اتباع اصول تنقید کو کرنی چاہیے۔[۸]

آگے لکھتے کہ ہم نے ادب اور ادباء کا تنقیدی اور تطبیقی مطالعہ تو خوب کیا ہے لیکن ہماری تنقید میں مطلوبہ اصول ومناھج کا فقدان نظر آتا ہے۔

سید قطب کے نزدیک مناہج تنقید کے چار اقسام ہیں: المنهج الفنی (فنی طریقہ)، المنهج التاریخی (تاریخی طریقہ)، المنهج النفسی (نفسیاتی طریقہ) اور المنهج المتكامل (متکامل طریقہ)۔ متکامل طریقے کو

---

[۷] ماخذ سابق، ص ۱۴۱

[۸] سید قطب، النقد الادبی اصولہ ومناھجہ، دار الشروق، قاھرہ، ۱۹۹۰م۔ ص ۷

وہ دوسرے مناہجوں پر فوقیت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایک طریقہ نہیں بلکہ یہ بقیہ تینوں مناہج سے مستفید ہوتا ہے۔ ان مناہج تنقید کو سید قطب نقوش منزل اور مینار مراد لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر ان مناہج کو مینار اور نقوش راہ کا درجہ دیا جائے تو یہ مناہج درست اور سود مند ثابت ہوتے ہیں لیکن اگر ان کو قیود و حدود مراد لیا جائے تو یہی مناہج فساد برپا کرتے اور مضر ثابت ہو جاتے ہیں۔[9]

یوروپی تنقید کے اصول و قواعد اور مناہج اپنانے میں ہمارے ادباء کے درمیان تضاد ہے۔ ناقدین کا ایک گروہ یورپی مناہج تنقید کو قابل تحسین قرار دیتے ہوئے تنقید نگاری میں ان کی بالادستی کا مطالبہ کرتا ہے جبکہ بعض ناقدین جدت کے تمام اصولوں اور طریقوں کی مخالفت کرتے ہیں۔

سید قطب ان دونوں طبقوں کے مقابلے میں یورپی مناہج تنقید کو اپنانے میں عدل واعتدال کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ان کے طریقوں سے مشروط استفادے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اگر یورپی مناہج تنقید میں وہ چیزیں ملیں جو عربی تنقید سے ہم آہنگ ہوں تو وہ ہمارے لیے سود مند ہو سکتے ہیں:

میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ عربی تنقید نگاری پر اجنبی مناہج تنقید کو مسلط کروں کیونکہ جس طرح عربی تنقید نگاری کی مخصوص تاریخی اور فطری نوعیت ہوتی ہے اسی طرح یوروپین تنقید کے بھی اپنے مخصوص حالات ہیں جو اس کے مزاج کی تشکیل میں لازمی طور پر کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے قدیم و جدید میں عربی تنقید کے تناظر میں ان مناہج تنقید پر بات کرنے کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ ہم عربی تنقید میں غیر عربی یا یورپی مناہج تنقید کو اسی وقت اپنائیں گے جب عربی تنقید کی طبیعت بھی اس کو اپنانے کے حق میں ہوگی اور بغیر کسی تکلف و تصنع کے اس کو اپنانے میں فکری نمود و ارتقاء ہوگا۔[10]

---

[9] النقد الادبی، اصولہ و مناہجہ، ص ۲۵۳

[10] ماخذ سابق ص ۸

ہندوستان اتنا ہی مسلمانوں کا ملک ہے جتنا کہ برادرانِ وطن کا

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

اسسٹنٹ پروفیسر وسابق صدر شعبہ اسلامک تھیالوجی، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا

mohdshamimakhter.qasmi@yahoo.com

نامعلوم زمانہ تاریخ سے ہی بر صغیر مختلف اقوام وملل کا وطن رہا ہے۔ تغیر زمانہ کے ساتھ دنیا کے مختلف خطوں اور متعدد علاقے کی قومیں یہاں آکر سکونت پذیر ہوئیں۔ چاہے وہ بہ تقاضائے بشریت یہاں آئے ہوں، یا پھر انہیں یہاں کی طبعی اور فطری نیرنگیاں نے ادھر کھینچ لائی ہوں۔ لیکن محققین ومورخین اور ماہرین آثار قدیمہ آج تک حتمی اور نتیجہ خیز بات کہنے سے قاصر ہیں کہ قدیم ہندوستان کے اصل باشندے کون ہیں، کہاں سے، کیوں اور کب آئے تھے؟ دراوڑ، کول، منگول اور آریا وغیرہ دنیا کے دیگر علاقوں سے نقل مکانی کرکے یہاں آئے ضرور تھے، مگر اس بات پر بیش تر عالموں کا اتفاق ہے کہ یہاں کی اصل اور پہلی قوم دراوڑ ہے۔[1] اس کے بعد ہی دوسری قومیں یہاں آکر بسیں۔ آریا کے یہاں آنے اور پھر ایک عرصے کے بعد، سرزمین ہند میں مستحکم اثر ورسوخ قائم کر لینے کی وجہ سے دراوڑا قوام کی جھرمٹ میں کس کے ساتھ ضم ہوگئی، اس کا بھی تعین نہیں کیا جاسکتا، جب کہ جنوبی ہند کا ایک طبقہ خود کو اب بھی دڑاوری قوم کی نسل سے بتاتا ہے۔ بہر حال آریا یہاں کب آئے اور ان کی تاریخ کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ہندوستانی مورخ راما شنکر ترپاٹھی رقم طراز ہیں :

> آریوں کے مورث اعلی کون تھے، ہماری تاریخی حدود میں وہ کہاں سے ابھر کر داخل ہوئے؟ اس قسم کے سوالات نے گم راہ کن تاریخی اختلافات پیدا کردیے ہیں۔ بعض ہندوستانی عالموں نے پرانوں کی شہادت کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے کہ آریہ ہندوستان کے اصلی اور سب سے قدیم باشندے ہیں، لیکن ان کے دلائل کو عالموں کی عام تائید حاصل نہیں ہوسکی۔ دیگر علما نے اتنے ہی زور کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ آریوں کا اصل وطن 'دائرہ قطب شمالی' تھا (بی. جی. تلک)؟ یا 'باختر' تھا (ردھور) یا 'پامیر' تھا۔ بہر حال عام خیال یہ ہے کہ ہندی آریہ نیز

---

[1] راما شنکر ترپاٹھی، قدیم ہندوستان کی تاریخ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص: ۳۹

اوستا کے دور کے ایرانی، قدیم ہندی جرمنوں (ہندی یورپیوں) کی ایک شاخ ہیں یا 'ورد'[۲] ہیں۔ مشرق کی جانب انتقال آبادی سے قبل ان کا مسکن ایک طویل عرصے تک مشترک رہا، جسے میکس مولر نے 'وسط ایشیا' کو، بنفے نے 'بحر اسود' کے شمال میں روس اور سائبیریا کے شمالی میدانوں کو، گیگر نے مغربی اور وسطی جرمنی کو، یاپی گاٹائس نے آسٹریا، ہنگری اور بوہیمیا کو قرار دیا ہے۔ انتقال آبادی کا باعث یا تو یہ ہوا ہو کہ وہ گروہوں میں بٹ گئے، یا ان میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور اختلافات شروع ہو گئے، یا ان کے مسکن کے محدود علاقے میں، ان کی آبادی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔[۳]

وادیٔ سندھ کے طول و عرض میں واقع ہڑپا اور موہنجوڈارو کی قدیم تاریخی یادگاروں کے باقیات اور کھنڈرات کی کھدائی کی روشنی میں آریا قوم کے آنے اور اس کے زمانۂ قیام کا حتمی تعین مشکل ہے۔ اس حوالے سے جو بات بھی سامنے آئی ہے، وہ سب خیالی بنیادوں پر مبنی ہے۔ اپنیشد ہو کہ پران یا پھر مہابھارت کی رزمیہ داستانیں اور اشلوک، ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔ مقدس وید کی تدوین بھی کافی تاخیر سے عمل میں آئی تھی۔ اس کا مدون کون ہے، اتنا پتا نہیں ہے۔ البتہ قیاس آرائیوں کے ذریعہ یہ طے ضرور کیا جاتا ہے کہ اسے مختلف خاندانوں کے شاعر پنڈتوں نے جمع و تصنیف کیا تھا۔ ان میں اکثر مرد اور دو یا تین عورتیں ہیں۔[۴] اس میں آریا قوم کے بعض اعمال و افعال کا اشارہ ضرور ملتا ہے، مگر اس کی رو سے بھی آریا کے احوال کا ٹھیک پتا لگانا امر مستبعد ہے۔ برطانوی ہند کے مورخ ونسنٹ آرتھر اسمتھ (۱۸۴۸-۱۹۲۰ء) کی کتاب 'قدیم تاریخ ہند' کے دیباچے میں ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کا انحصار یونانی سیاحوں کے سفر نامے ہیں۔ ان کے بعد چینی اور پھر عرب سیاح کچھ حوالوں سے مواد فراہم کرتے ہیں۔[۵] راما شنکر ترپاٹھی تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے اصل باشندوں کا پتا لگانا ہی مشکل ہے کہ وہ کون تھے، کب یہاں آئے؟ کیوں کہ تاریخ کا فقدان ہے۔ جو بھی شہادت ہم کو ملتی ہے اس کا زیادہ تر انحصار یونان اور روم کی کلاسیکی کتابوں کے علاوہ چینی ادب بھی قدیم ہندوستان کی تاریخ مرتب کرنے میں بڑا سہارا دیتا ہے۔ پھر وہ مسلمان مورخین کا نام لے کر بتاتے ہیں

---

[۲] گلائلس 'ورد' کی اصطلاح ان آدمیوں کے لئے استعمال کی ہے جو قدیم زبانوں میں ملتے ہیں

[۳] ماخذ سابق، ص: ۵۲-۵۳

[۴] ماخذ سابق، ص: ۵۴

[۵] وی۔ اے۔ اسمتھ، قدیم تاریخ ہند، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص: ۵

کہ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے رفتہ رفتہ ہندوستان کو کیوں کر فتح کیا اور کس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا۔ اس میں انہوں نے ابو ریحان البیرونی (۹۷۳-۱۰۱۸ء) کو سرفہرست رکھا ہے۔[۶]

مذہبی تناظر میں بھی دیکھا جائے تو دستیاب تاریخی کتب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل از اسلام برصغیر میں متعدد مذاہب پائے جاتے تھے۔ ہر مذہب کا پیروکار ایک دوسرے پر اپنا مذہبی تفوق جتلانے میں لگا ہوا تھا اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر کشت و خوں کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ فرماں روا اشوک (تقریباً ۲۶۹ ق م) کے طویل زمانۂ حکومت میں یہاں کیا کچھ نہیں ہوا، نہ جانے کتنے لوگوں کا اس نے خون بہایا، اگرچہ بعد میں اس نے پرستاران انسانیت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ یہی حال جینیوں کا بھی تھا۔ جب ان کے درمیان مذہبی مناظرے اور منافشے کی مجلسیں آراستہ ہوتیں تو اس کے شور سے فضا گونج اٹھتی تھی۔

یہود و نصاریٰ نے بھی زمانۂ قدیم کے کسی دورانیے میں ہندوستان کا رخ کیا تھا اور ایسی شہادتیں بھی کثرت سے ملتی ہیں کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے اس ملک کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ تاریخ 'ملیبار' کے مصنف اور ماہر آثار قدیمہ سید شمس اللہ قادری (۱۸۸۵-۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں کہ عہد عتیق کے مقدس صحیفوں سے پتا چلتا ہے کہ داؤد اور سلیمان علیہم السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل نے جنوبی ہند میں واقع ساحلی علاقہ 'مالابار' سے تجارتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔[۷] مزید برآں ۵۲ء میں مذہب نصاریٰ کی اشاعت کے لئے مقدس 'تھوما' یہاں کے ایک علاقہ 'کرنگانور' میں آئے اور وہ اپنے مذہب کی اشاعت میں مصروف ہوگئے۔ ان کی دعوت پر کافی لوگوں نے مسیحی مذہب کو قبول کر لیا تھا، جس کی بنا پر اس نے مختلف مقامات پر آٹھ کلیساؤں کی تعمیر کی۔ پھر وہ یہاں سے نکل کر جنوبی ہند کے مشرقی ساحل 'معبر' پہنچے، تاکہ اپنے دین کو مزید وسیع کر سکیں، مگر یہاں کے مقامی باشندوں نے ان کا قتل کر دیا۔[۸] قادری نے یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں آنے اور قیام کے حوالے سے اور بھی تاریخی معلومات فراہم کی ہیں۔ ماضی میں انگریز نہ صرف برصغیر میں آئے تھے، بلکہ اپنی کمال دانش مندی کی وجہ سے کافی

---

[۶] ترپاٹھی، قدیم ہندوستان کی تاریخ، ص: ۲۷-۲۸

[۷] حکیم سید شمس اللہ قادری، ملیبار، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء، ص: ۱۱

[۸] ماخذ سابق،، ص: ۱۶-۱۷

عرصے تک یہاں اپنی حکم رانی کا جھنڈا بھی لہرایا تھا، اگرچہ بعد میں اس کو ملک چھوڑ کر جانا پڑا۔ ان میں سے جو لوگ یہیں رہ گئے وہ بھی یہاں کی مٹی سے رل مل گئے۔ ان سب کے علاوہ ان کے بارے میں ان کی آسمانی کتابوں میں مذکور بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی ان کا رشتہ تعارف کے طور پر ہی سہی، ہندوستان سے جڑا ہوا تھا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

مسیح سے دو ہزار برس پہلے جو عرب تاجر بارہا مصر کو جاتے دکھائی دیے ہیں، ان کا سامان یہ تھا: بلسان، صنوبر اور دوسری خوش بودار چیزیں (پیدائش، ۳۷: ۲۶)۔ یمن کی ملکہ حضرت سلیمانؑ کے لئے جو تحفہ ۹۵۰ ق م میں شام لائی تھی وہ بھی 'خوش بو کی چیزیں، بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہر' [دوم ایام، ۶: ۹] حزقیال نبی (سنہ ۵۲۸ ق م) کے زمانے میں اوزال (یمن) سے فولاد، تیز پات اور مصالحہ، عرب ہی ملک شام کو لے جاتے تھے۔ حزقیال نبی کہتے ہیں کہ: 'اوزال (یمن) سے تیرے بازار میں آبدار فولاد، تیز پات اور مصالحہ بیچنے آتے ہیں' [حزقیال، ۲۷: ۱۹]۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ لوبان اور قسم قسم کی خوش بو پھول خود یمن میں پیدا ہوتے تھے، مگر آبدار فولاد (تلوار)، تیز پات اور مسالوں کا ملک ہندوستان ہی تھا اور تلوار، تیز پات اور مصالحوں کا ملک وہی آج بھی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عربوں کے ہندوستان کے تجارتی تعلقات مسیح سے کم از کم دو ہزار برس پہلے سے ہیں۔[9]

اسی طرح تاریخ کے معلوم اور روشن عہد میں ہندوستان کو عرب مسلمانوں نے اپنے وجود سے زینت بخشی اور مرور زمانہ کے ساتھ، یہاں کی تہذیب و ثقافت کو مالا مال کیا۔ جب ہم اسلام کے ابتدائی زمانے کی تاریخ اور تذکروں کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے 'الٰہی نظام حیات' پر سختی سے کاربند تھے اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہندوستان کے باشندے، چاہے جس قوم سے تعلق رکھتے ہوں، یا جس مذہب کے ماننے والے ہوں، ان میں سے اکثریت نے مسلمانوں کا اور ان کے ساتھ لائے ہوئے 'الٰہی نظام حیات' کا استقبال کیا۔ ابتدا میں معمولی جھڑپوں کا ہونا فطری امر تھا۔ آریائی قوم کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا، مگر بعد میں سب ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔

دنیا کے آسمانی مذاہب کی فہرست میں اسلام کو غیر معمولی تفوق حاصل ہے۔ اس کا پیغام کسی بھی ملک، کسی بھی قوم اور کسی بھی فرد کو اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے، جس کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان کے پاس 'قرآن' کی شکل میں ایک لازوال 'نظام حیات' تھا اور جس

[9] علامہ سید سلیمان ندویؒ، عرب و ہند کے تعلقات، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، جدید ایڈیشن، ص: ۵۵

میں یہ صراحت موجود ہے کہ دنیا کے تمام انسان مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور سب آدم کی اولاد ہیں اور انہیں مختلف قبائل میں بانٹ دیا گیا ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور اللہ تعالیٰ کو وہی شخص زیادہ محبوب ہے، جو متقی ہے (الحجرات: ۱۳)۔ اس کی تفسیر و تفصیل 'حدیث نبوی' کی شکل میں ان کے ہاتھوں میں موجود تھی۔

زمانۂ قدیم سے ہی ہندوستان کا تعلق دیارِ عرب سے کتنا گہرا تھا، اس کی تفصیلات جاننے کے لئے سید غلام علی آزاد بلگرامیؒ (۱۷۰۴-۱۷۸۶ء) کی کتاب 'سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان' کے مقدمہ کی طرف مراجعت کی جائے، یا قاضی اطہر مبارک پوریؒ (۱۹۱۶-۱۹۹۶ء) کی کتاب 'عرب و ہند عہد رسالت میں' کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کتابوں میں ہندوستان کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور محققانہ کلام کیا ہے۔ دوسرے شواہد سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام اپنا تعارف عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی کرا چکا تھا اور اہل ہند کے دلوں میں اس کے جاننے اور سمجھنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔[10] حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اہل ہند سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کے بارے میں کئی مواقع سے تحسین آمیز کلمات زبان مبارک سے ادا فرمائے۔ چناں چہ معجزۂ معراج نبویؐ کے احوال بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

"رأیت عیسیٰ وموسیٰ وابراھیم، فاما عیسیٰ فاحمر جعد عریض الصدر، واما موسیٰ فادم جسیم سبط کأنہ من رجال الزط"۔[11] (میں نے عیسیٰؑ موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کو دیکھا۔ جہاں تک عیسیٰ کا تعلق ہے وہ سرخ، گھنگریالے بال اور چوڑے سینے والے تھے اور جہاں تک بات موسیٰ کی ہے تو وہ گندمی رنگ کے خوش قامت تھے، گویا وہ جاٹوں میں سے تھے۔)

قوم 'زط' کا تعلق ارض ہند سے ہے، جسے ہندوستان میں 'جاٹ' کے لقب سے جانا جاتا ہے۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

"من ھٰولاء القوم ؟ کانھم رجال الھند!"[12] (یہ کون لوگ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی ہیں۔)

---

[10] زین الدین المعبری، تحفۃ المجاہدین فی احوال البرتغالین، موسسۃ الوفا، بیروت، لبنان، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۲۳-۲۲۴

[11] ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الانبیاء، باب قول عز و جل واذ کر فی الکتاب مریم اذ انتبذت من اہلہا

[12] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ، ۱۳۵۵ھ، ج: ۲ ص: ۵۹۳۔

یہاں تک کہ نبیؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو ہندوستان کے حوالے سے بہت سی بشارتوں سے بھی نوازا تھا۔ امام نسائی نے اپنی سنن میں اس سلسلے کی کئی احادیث نقل کی ہیں۔ ان میں سے دو کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور تیسری کے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ہیں۔[۱۳] ان سب کے علاوہ ایسی بھی شہادتیں بہ کثرت ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی عرب و ہند آپس میں تجارتی لین دین کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنی کشتیوں اور جہازوں کو سمندر کی لہروں پر دوڑاتے اور ایک دوسرے سے نہ صرف ملتے جلتے، بلکہ تجارتی اشیا کی خرید و فروخت کرکے اپنے اپنے وطن لوٹ جاتے تھے اور انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو ان ساحلوں پر آباد ہوگئے تھے۔ اس طرح دونوں ملکوں کی آبادی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا اور اسی وجہ سے ان ساحلی علاقوں میں باضابطہ بستیاں وجود میں آگئی تھیں۔ جنوبی ہند کا ساحلی علاقہ اس کی واضح مثال ہے۔ پروفیسر محمد اسلم (۱۹۳۲-۱۹۹۸ء) لکھتے ہیں:

> عرب و ہند کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات از منہ قدیم سے چلے آتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں مسقط و عمان میں کھدائی کے دوران ماہرین آثار قدیمہ نے وہاں وادی سندھ کی تہذیب و ثقافت کے نمونے دریافت کئے ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت سے تین ہزار سال قبل عرب اور سندھ کے درمیان تجارت ہوا کرتی تھی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ جنوبی عرب کا قدیم رسم الخط 'مسند' کہلاتا ہے جو 'سندھ' سے مشتق ہے۔ یمن میں ایسے کتبے ملے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی عرب سے بڑی تعداد میں لوگ تلاش معاش میں قلات چلے آئے تھے۔[۱۴]

قرآن کریم میں بھی کئی مقامات پر بحری جہازوں کا ذکر موجود ہے، جس سے ثبوت ملتا ہے کہ اہل عرب بحری سفر کیا کرتے تھے۔ وہ بحر ہند کے ساحلوں پر آتے اور تجارتی اشیا کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی بہت سی اشیائے خورد و نوش کے اسما کثرت استعمال کی وجہ سے عربی میں مستعمل ہونے لگے۔ مثلاً: 'بیڑے' کو عربی میں 'بارجہ'، 'چندن' کو 'صندل'، 'کپور' کو 'کافور'، 'کرن پھل' کو 'قرنفل'، 'پلپل' کو 'فلفل'، 'نیلو پھل' کو 'نیلوفر'، 'جائے پھل' کو 'جائفل'، 'تری پھل' کو 'اطریفل' اور 'ناریل' کو 'نارجیل' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی دیگر اشیا کے نام ہیں، جن کی تفصیلات

---

[۱۳] عبدالرحمن احمد بن شعیب بن علی بن سنان النسائی، سنن النسائی، کتاب الجہاد، باب غزوۃ الہند

[۱۴] پروفیسر محمد اسلم، محمد بن قاسم اور ان کے جانشین، ریاض برادرز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۹

احادیث نبوی، عربی لغت اور تاریخ وسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے متعدد حوالوں کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ تین ہندی الفاظ ایسے ہیں، جن کا تذکرہ ہماری مقدس کتاب قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس سلسلے میں اچھا خاصہ علما میں اختلاف رہا ہے، کہ قرآن پاک میں کسی غیر زبان کا لفظ ہے یا نہیں؟ لیکن فیصلہ یہی ہوا ہے کہ غیر زبان کے ایسے الفاظ موجود ہیں جو عربی کی زبان میں آکر مستعمل ہو گئے تھے اور وہ اپنی پہلی صورت بدل کر عربی زبان کے لفظ بن گئے۔ حافظ ابن حجر اور حافظ سیوطی نے قرآن پاک کے اس قسم کے لفظ جمع کئے ہیں۔ ہم ہندیوں کو بھی فخر ہے کہ ہمارے دیس کے بھی چند لفظ ایسے خوش نصیب ہیں جو اس پاک اور مقدس کتاب میں جگہ پاسکے۔ پہلے علما نے جن الفاظ کا ہندی ہونا ظاہر کیا تھا وہ تو لغو اور بے بنیاد تھے، مثلاً 'ابلعی' کی نسبت یہ کہنا کہ ہندی میں اس کے معنی 'پینے' کے ہیں یا 'طوبیٰ' کو ہندی کہنا، جیسا سعید بن جبیر سے روایت ہے [الاتقان فی علوم القرآن، نوع ۳۸] بے بنیاد ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ جنت کی تعریف میں اس جنت نشان ملک کی تین خوشبوؤں کا ذکر ضرور ہے، یعنی مسک (مشک)، زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور)۔[15]

یہ اسما قرآن کریم کی درج ذیل سورتوں میں وارد ہوئے ہیں: "إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوراً۔" (الدہر: ۵) (نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پیئیں گے، جن میں 'کافور' کی آمیزش ہوگی۔)

"وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْساً كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلاً۔" (الدہر: ۱۷) (نیک لوگوں کو وہاں (جنت میں) ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے، جس میں 'سونٹھ' کی آمیزش ہوگی۔)

"يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ، خِتَامُهُ مِسْكٌ۔" (المطففین: ۲۵-۲۶) (نیک لوگوں کو (جنت میں) ایسی نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی، جس پر 'مشک' کی مہر لگی ہوگی۔)

قرآنی آیات میں شامل اشیا کی وضاحت کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

نہ ان کی تعریب ہوئی ہے اور نہ تہنید، بلکہ دونوں زبانوں کے یہ الفاظ اصلی ہیں اور ان کو مستقل حیثیت حاصل ہے۔ البتہ ان ناموں کی جو چیزیں ہیں وہ خاص ہندوستانی ہیں اور یہیں سے عرب میں جاتی تھیں۔ ان اسما و اشیا کے لئے قرآنی الفاظ بننا بڑے فخر کی بات ہے۔ پھر مزید برآں یہ کہ

---

[15] عرب و ہند کے تعلقات، ص: ۵۴

جنت کے نعائم ولذات میں ان کو خاص مقام حاصل ہے، یعنی جنت کی یہ نعمتیں اور لذتیں دنیاوی نعمت ولذت کے انداز میں ہندوستان کو حاصل ہیں اور اس کی خبر قرآن حکیم نے دی ہے۔[۱۶]

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل عرب ممالک میں بھی ہندوستانی بڑی تعداد میں موجود اور ایک ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ انہیں وہاں بہ طور تعارف مختلف القاب اور ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ تاریخ عرب میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے کہ اہل عرب نے ہندیوں سے کبھی یہ سوال کیا ہو کہ تم یہاں کیوں آئے اور تم نے یہاں کیوں سکونت اختیار کر رکھی ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

ہندوستان اور عرب کے قدیم ترین تجارتی تعلقات کے بعد ایران کے توسط سے اس حاکمانہ تعلق نے ان میں عرب سے مزید دلچسپی پیدا کی اور یہاں کے لوگ ہندوستانی اشیا کی تجارت، عرب کے جہازوں اور کشتیوں پر ملازمت اور عرب میں آباد ہو کر وہاں کے اقامت میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینے لگے، جس کے نتیجے میں عہد رسالت میں عرب کے اندر ہندوستانیوں کی مختلف قومیں اور جماعتیں رہنے لگیں اور ان کو عرب کے باشندے اپنی زبان میں مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے۔ چناں چہ عربوں نے اپنے ملک میں آباد ہندوستانیوں کو زط، اسادرہ، سیابجہ، احامرہ، مید، بیاسرہ اور تکاکرہ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا۔ کسی ملک کے آدمیوں کے اتنے زیادہ نام ولقب سے یاد کرنا اس کی صریح دلیل ہے کہ وہاں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ہر طرف مشہور تھے۔ چوں کہ عربوں اور ہندوستانیوں میں بڑی حد تک مذہبی یک جہتی تھی اس لئے وہ بڑی آسانی سے عربوں کی زندگی میں مل جل گئے۔[۱۷]

مسلمان یہاں ایسے ہی نہیں آئے تھے، بلکہ اسے وہ اسپرٹ، وہ بھینی بھینی خوشبو اور وہ فضیلت لے کر آئی تھی، جس کے بارے میں اس نے قرآن کی آیتوں سے جانا، زبان نبوی سے سمجھا، دستیاب کتابوں میں پڑھا اور اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ مذہب اسلام کا دیار ہند سے کیا رشتہ ہے اور اسی کشش نے اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ وہ یہاں آ گئے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے اور اپنے وجود مسعود سے وطن کے لئے، ملک کے باشندوں کے لئے اور دیس کی ہر چیز کے لئے نافع بننے کی کوشش کی۔ اس کا ثبوت ملک کے چپے چپے

---

[۱۶] قاضی اطہر مبارک پوری، عرب وہند عہد رسالت میں، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۵۴

[۱۷] ماخذ سابق،، ص: ۱۲

میں پھیلے ہوئے اسلامی ثقافت اور تہذیب و تمدن سے معمور و منور باقیات صالحات ہیں، جو ماضی کی یاد یں تازہ کراتے ہیں۔

بحرین کے دو قبیلے بنو تمیم اور بنو عبد القیس تاجر تھے اور ان کے تجارتی تعلقات سر دیپ (موجودہ سری لنکا) اور وہاں کے راجا سے بڑے اچھے تھے۔ بنو تمیم کی ایک ذیلی شاخ 'بنی یربوع' تھی۔ اسی خاندان کی مظلوم خاتون نے راجا داہر کے زمانے میں، جو سندھ کا راجا تھا، سندھی 'قزاقوں' کے ہاتھوں لوٹ مار اور گرفتاری کے وقت گورنر عراق حجاج بن یوسف ثقفی (۶۶۱-۷۱۴ء) کو اپنی مدد کے لئے آواز لگائی تھی۔[۱۸] یہ اور اس طرح کی بعض دوسری وجوہات تھیں، جن کی بناپر مسلمانوں کے لئے تسخیر سندھ کا فوری جواز پیدا ہو گیا تھا۔ حجاج بن یوسف کے حکم سے محمد بن قاسم الثقفی (۶۹۵-۷۱۵ء) ارض سندھ و ہند پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے دو تین سالوں کی مختصر مدت میں نہ صرف پورے سندھ کو اسلامی قلم رو میں شامل کر لیا بلکہ سندھ کے ملحق علاقوں تک اپنے قدم جما لئے تھے۔[۱۹] اس نوجوان صالح نے ارض سندھ کو ہی فتح نہیں کیا تھا، بلکہ اپنے کریمانہ اخلاق و کردار سے یہاں کے باشندوں کے قلوب کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جب محمد بن قاسم بغض و عناد کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں چلے گئے اور اس کی خبر اہل ہند کو ہوئی تو اس نے نہ صرف افسوس کا اظہار کیا اور آنسو بہائے، بلکہ مستقبل میں ان کی یادوں کا دریچہ کھلا رکھنے کے لئے 'کیرج' کے لوگوں نے ان کی شبیہ بنا کر نصب کر لی تھی: "فبکی اهل الهند علی محمد وصوروه بالکیرج۔"[۲۰]

اس کے بعد عرب مسلمانوں نے کثرت سے شمالی ہند کا رخ کیا اور وہ بتدریج ہندوستان کے طول و عرض میں چھا گئے۔ مسلمانوں نے مقامی باشندوں کے ساتھ مل جل کر اسلامی تہذیب و ثقافت اور تعلیم و تعلم کو فروغ دیا، نئے سماج و معاشرہ کی تشکیل کی اور ایک جدید ہندوستان کی داغ بیل ڈالی۔ مسلمان خاندانوں کے متعدد حکم رانوں نے یہاں کم و بیش ایک ہزار سال تک، بلا تفریق مذہب و ملت حکومت کی اور اپنے وجود مسعود کی برکات سے ہندوستان کو دنیا کی سلطنتوں میں وہ مقام دلایا جس پر دوسروں کی دزدیدہ نظریں ٹک گئی تھیں۔ چناں چہ مغلیہ حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے یہاں اپنا

---

[۱۸] احمد بن یحیٰ البلاذری، فتوح البلدان، تحقیق: عبد اللہ انیس الطباع، موسستہ المعارف، بیروت، ۱۹۸۲ء، ص: ۶۱۱

[۱۹] ماخذ سابق، ص: ۶۱۲ وبعدہ

[۲۰] ماخذ سابق، ص: ۶۱۸

اقتدار قائم کرلیا اور کم و بیش دو سو سال تک یہ ملک ان کے قبضہ میں رہا۔ اگرچہ اہل ہند کی مشترکہ انتھک کوششوں اور عظیم قربانیوں کے بعد ۱۹۴۷ء میں برطانوی سامراج کے قبضہ واقتدار سے ہندوستان آزاد تو ہوگیا، مگر جاتے جاتے اس نے ملک کی تقسیم کا جو زہر گھول دیا تھا، اس کے تلخ نتائج سے سبھی کو دوچار ہونا پڑا اور عرصہ گزر جانے کے بعد، آج بھی اس کا خمیازہ بھگتنا جا رہا ہے۔

ہندوستان کے اصلی باشندے کون ہیں؟ جو ماضی کی خیالی داستانوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، کون یہاں کب آیا اور کس کو یہاں رہنا چاہئے یا نہیں، کو موضوع بحث بنانے یا اس کی آڑ میں خاص کر یہاں کی ایک بڑی اقلیت پر نشانہ سادھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ فضول اور لغو باتیں ہیں۔ ان سے جہالت و عصبیت پر مبنی فکر کی غمازی ہوتی ہے۔ مزید برآں یہ باتیں کسی بھی مہذب سماج اور ترقی پذیر ملک کے لئے بد قسمتی کی علامات ہیں۔ گفتگو اس بات پر ضرور ہونی چاہئے کہ جن کے آباء واجداد نے تاریخ کے کسی بھی دورانیے میں یہاں سکونت اختیار کی اور اس کی خاک میں پیوست ہوگئے، وہ سب ہندوستانی ہیں اور ہر ایک کو ہندوستانی کہلانے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہندو، بدھ، جین، سکھ بھائیوں کو ہے۔ ہر ایک شہری کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اور ضمانت کی ذمہ داری نہ صرف حکومت وقت کی، بلکہ ہم سب کی بھی ہے۔ اسے سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔ یہی ہندوستان کے آئین کی روح اور گنگا جمنی تہذیب کی پکار ہے۔ جب تک یہ تصور عام نہیں ہوگا، ہم ہندوستان کی تنظیم نو اور تعمیر جدید کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں کرسکتے۔ غیر منقسم ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) نے رام گڑھ کے سالانہ کانگریس سیشن ۱۹۴۰ء کا خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

> ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں

نے، پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا..... ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی، جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچادیا...... تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے، جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے، تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگان ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں..... ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے، جس پر اس مشترکہ زندگی کی چھاپ نہ لگی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بے گانہ تھے، مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔"[۲۱]

---

[۲۱] مولانا ابوالکلام آزاد، خطبات آزاد (مرتب: مالک رام) ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۹۸-۲۹۹

سلطنت آصفیہ کی مذہبی بے تعصبی

محمد عمیر الصدیق ندوی

آزادی سے پہلے دہلی کی مرکزی حکومت کے ساتھ جن ہندوستانی ریاستوں کو محدود خود مختاری حاصل رہی۔ان میں حیدر آباد دکن کی ریاست سلطنت آصفیہ اپنی وسعت اور دولت کے لحاظ سے سب سے نمایاں تھی۔ برار، خاندیش، تلنگانہ، دولت آباد، گولکنڈہ اور بیدر یعنی آج کے نقشے کے لحاظ سے مہاراشٹر، آندھرا، تلنگانہ، کرناٹک اور تامل ناڈو کے بعض حصوں پر مشتمل یہ سلطنت کسی بڑے ملک سے کم نہیں تھی، یعنی کل رقبہ بیاسی ہزار میل سے زیادہ اور اسی لحاظ سے آبادی بھی کروروں میں تھی جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی، مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی بھی تھے، آخری حکمراں نواب میر عثمان علی خاں نظام الملک آصف جاہ سابع تھے ، جن کے عہد کو سلطنت کا آخری دور کہا گیا ، لیکن دوسری حکومتوں کی طرح اس کے خاتمہ میں زوال کی بات نہیں کہی گئی، حیدر آباد ،نظام سابع کے زمانہ میں فرخندہ بنیاد شہر نگاراں، جنت قلب و نگاہ اور عروس البلاد کہلانے کے دعوی کو مضبوط تر بناتا رہا۔عام طور سے حیدر آباد دکن کو اس کی خاص تہذیب ، علم و ادب کی سرپرستی تعلیمی و علمی اداروں کی ترقی ، معاشرت کی منفرد بوقلمونی اور نظام اور ان کے امراء کی فیاضی اور علوم وفنون کی قدردانی کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ساتھ ہی اس کی یادوں میں سلطنت آصفیہ کی گنگا جمنی تہذیب کا بھی ضرور ذکر کیا جاتا ہے۔ اب آزادی کے پچھتر سال بعد ملک جس فضا میں سانس لے رہا ہے اس میں گنگا جمنی تہذیب واقعی عہد رفتہ کی کسی بھولی بسری داستان کا عنوان ہی بن کر رہ گئی ہے۔ایسے میں حیدر آباد کی سلطنت آصفیہ میں عام خوش حالی، نظام عدل و انصاف آب پاشی ، بلدیاتی نظام ، صنعت و حرفت، تعلیم و صحت ،ڈاک ، زراعت، آب رسانی، امداد باہمی، جیسے امور مملکت کا ذکر اب اپنوں کی زبان پر نہیں آتا ہے، غیر تو خیر ہر نقش کے مٹانے کے درپے ہی ہیں۔تاہم حکایت مہر و وفا سنا ہر حالت میں ضروری ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک بار لکھا تھا:

> حیدر آباد دکن کا رقبۂ حکومت محدود ہے مگر سچ یہ ہے کہ اس کے انوار کرم کی تابانی سے ملک ہند کا ذرہ ذرہ روشن ہے۔ وہ اپنی تاریخی روایات کی بنا پر سلطنت مغلیہ کی یادگار اور ہندوستان کی امیدوں کا چراغ ہے جس میں امن و امان ، عدل و انصاف اور ہندو مسلمان کی باہمی یکجہتی آنکھوں کے سامنے گزرتی ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے اور نظام سابع کے راج پر مکھ کہلائے جانے سے بہت پہلے

ان ہی نظام سابع میر عثمان علی خاں نے ۱۹۳۳ء میں ایک موقع پر لکھا تھا کہ : سب سے بڑی نعمت میرے لیے میرا آبائی مذہب دین اسلام ہے، میرا خاتمہ اسی پر ہو۔ اگر کوئی چیز درحقیقت میری ذاتی ملک ہے اور وہ بھی ایسی جو بطور زاد آخرت میرے کام آسکے اور یہاں سے میرے ساتھ جائے تو وہ فقط میرا ایمان اور جذبہ قلبی ہے، باقی کچھ نہیں۔

ایک طرف تو یہ ایمان دوسری جانب یہ فرمان کہ :

بہ حیثیت رئیس میں ایک دوسرا مذہب بھی رکھتا ہوں جس کو صلح کل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ میرے زیر سایہ مختلف مذاہب و فرقے کے لوگ بستے ہیں اور ان کے معابد کی نگہداشت میرے آئین سلطنت کا ایک زمانہ سے وطیرہ رہا ہے۔

نظام حیدر آباد کی یہی وہ روشن خیالی تھی جس کا اعتراف ۱۹۴۲ء میں حیدر آباد کے ایک یوروپی سیاح بیولی نکلسن نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ : وہ (نظام) مسلم طور پر ایک روشن خیال بادشاہ ہیں۔

اسی سیاح نے حیدر آباد کے فن تعمیر کے متعلق لکھا تھا کہ ''اس نے صرف ہندوستان ہی نہیں، ساری دنیا میں جو بہترین عمارتیں دیکھی ہیں، ان میں سے عثمانیہ یونیورسٹی بھی ہے، جدید فن تعمیر کا لاجواب نمونہ ہونے کی حیثیت سے یہ عمارت ایسی ہے کہ یورپ یا امریکہ کی کسی عمارت کو اس سے بہتر قرار دینا مشکل ہے۔

جامعہ عثمانیہ میں ہندوانی طرز کے لحاظ سے تعمیر پایوں اور ستونوں پر سبک اور نفیس مسلم تعمیر کی پہچان، کمانیں بنادی گئیں، مسلم دریچوں کی تزئین ہندوانہ بیلوں سے کی گئی۔ تعمیر میں یہ خوبیاں محض کاریگروں کی مہارت کی غماز نہیں تھیں، اس کی تہہ میں بقول نکلسن ''گویا دو ایسے کلچروں کی روحیں جو ایک دوسرے سے مختلف، یکدم الگ اور بالکلیہ ممتاز ہیں یکایک اس حقیقت سے باخبر ہو گئیں کہ ان تمام اختلافات کے باوجود دونوں ایک ہی عمومی چشمہ سے پیدا ہوئیں جس کا نام ''حسن'' ہے۔

ہندوستان میں ایک بڑی مسلم سلطنت کے حکمراں ہونے کی وجہ سے نظم و نسق اور سیاسی معاملات میں نظام دکن کے مقتدر اعلیٰ ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ لیکن سر مرزا اسماعیل جنہوں نے ریاست کے انگریز ریزیڈنٹ سر ولیم بارٹن کی دعوت پر اگست ۱۹۴۶ء میں بطور وزیر اعظم حیدر آباد کی ذمہ داری سنبھالی، ان کا کہنا ہے کہ نظام صرف نظری حیثیت سے مقتدر اعلیٰ تھے، اصل اقتدار تو اکزیکیوٹیو کونسل کو حاصل تھا۔ سر مرزا اسماعیل کا بیان ہے کہ جب میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ حضور نظام ہندوستان میں سب سے زیادہ دستوری حکمراں ہیں تو لوگوں کو یقین نہیں ہوتا۔ یہ بات سن کر بقول مرزا اسماعیل نظام

خوب ہنسے۔ یہ الفاظ یہاں بے ضرورت اور بے محل دہرانے کے لیے نہیں، موجودہ حالات میں جس طرح مسلمانوں کے نظام حکومت کو ظالمانہ، جارحانہ، جابرانہ دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے اس کی حقیقت غیر جانب دار اور سچے اور ایماندار مورخین نے محمد بن قاسم سے بہادر شاہ ظفر تک پوری طرح عیاں کردی ہے۔ ان کے جلو میں مرکز سے دور یا غیر مطیع ریاستوں کے حکمرانوں اور نوابوں نے جس طرح کثیر مذہبی و تہذیبی علاقوں میں انسانی وسائل کو قومی ترقی کے فروغ کے لیے استعمال کرکے ملک سے محبت کا خوبصورت ترین نمونہ پیش کیا، اس کو پھر سے پیش کیا جانا ضروری ہے۔

یہاں حیدرآباد دکن کی سلطنت آصفیہ کا ذکر یہاں وہاں سے بے ترتیب ہی سہی پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ حقیقت کی کچھ کرنیں سمیٹی جائیں۔ سر مرزا اسماعیل تو حیدرآباد کے صرف ایک سال وزیر اعظم رہے، انہوں نے بنگلور اور جے پور جیسے شہروں کی جدید منصوبہ بندی کے ذریعہ شہری تعمیر میں ممتاز ترین مقام حاصل کیا وہ جب یہ لکھتے ہیں تو ان کی تحریر اپنی اہمیت کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتی ہے: ”ریاست حیدرآباد نے صحیح معنوں میں ہندو مسلم اتحاد کا خوشگوار منظر پیش کیا تھا۔ حیدرآباد کی سماجی زندگی ہندو مسلم تہذیب کا سنگم تھی“۔ ریاست میں مہاراجہ سر کشن پرشاد جیسے امیر سے بڑھ کر نظام کا کوئی وفادار نہ تھا۔ خود مہاراجہ برسوں نظام کے وزیر اعظم رہے۔ میرے لیے حیدرآباد میں یہ معلوم کرنا بڑا دشوار تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان؟

خالدہ ادیب خانم جو کبھی ہندوستانیوں کے لیے معروف ترکی ادیبہ تھیں۔ انہوں نے حیدرآباد کی سیاحت کی، انہوں نے دیکھا کہ حیدرآباد میں ہندو مسلم عورتیں بغیر کسی نسلی یا مذہبی تعصب کے مل جل کر رہتی ہیں، خالدہ خانم نے حیدرآباد کے سرکاری یتیم خانہ کا انتظام دیکھا تو لکھا کہ ”میرے نزدیک تمام ہندوستان کے لیے صحیح قسم کا ابتدائی مدرسہ ہے کہ اگر ہندوستان کسی یکساں پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا انتظام کرے اور اسے اپنے مفلوک الحال عوام کی ضرورتوں کے مطابق بنائے، اس کا یہ نمونہ ہوگا“۔ نظر کے ساتھ اگر ظرف بھی وسیع ہو تو سچائی دیکھی بھی جاسکتی ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا جاسکتا ہے۔ حیدرآباد دکن کی تاریخ نوابوں اور امرائے ریاست کے تذکروں سے اسی طرح مالامال ہے جس طرح نظام کے خزانے ہیروں اور جواہرات سے معمور تھے۔ مگر ان نوابوں اور امراء میں جس شان سے مہاراجوں کو عزت اور درجات کی بلندی حاصل تھی، اگر اس پر ایک نظر ڈال لی جائے تو پھر نظام اور ان کی سلطنت سے نجات پانے کی خوشی کے اظہار کو بجز روایتی احساس کمتری کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔

راجہ چندو لعل مہاراجہ بہادر کو امور ریاست کا مختار بنایا گیا، سات ہزاری منصب نوبت، گھڑیال اور جواہر عمدہ اور لاکھوں روپے محاصل جاگیر جیسے اعزازوں سے نوازے گئے۔ مہاراجہ ہر سال دو شالے اور دوسرے پوشاکی جوڑے، دسہرے کے وقت تقسیم کرتے کاشی، جگن ناتھ، رام ناتھ، تروپتی کو وہ بھاری رقمیں عطا کرتے۔ قریب دو سو سال پہلے سے یہ مہاراجہ دوشنبہ کے دن تین ہزار روپے اور ہر روز سو روپے دان کرتے، گوکل اشٹمی، رام نومی اور شیوراتری پر بھی بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے۔ ان کے بیٹے راجہ دھیراج بہادر بھی لاکھوں کی جاگیر سے سرفراز ہوئے۔ قلعہ فرخ نگر میں بڑی رقم خرچ کر کے مندر بنوایا اور وہاں لوگوں کو جواہر، جوڑے، دوشالے وغیرہ عنایت کیے۔ دوسرے بیٹے نانک بخش تھے، انہوں نے جلسل گوڑہ میں مندر بنوایا، ہر سال یاترا کے دنوں میں بے حساب خرچ کرتے، برہمنوں کو مقرر کیا تھا کہ وہ حضور پرنور کی سلامتی کی دعا میں مصروف رہیں۔

چندو لعل مہاراجہ کے چھوٹے بھائی راجہ گوبند بخش کو پوری ریاست کے نصف علاقے کا انتظام سپرد کر دیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطنت آصفیہ کا نصف سے زیادہ حصہ ہندو راجاؤں کے زیر انتظام تھا، راجہ سکسر لال بہادر، راجہ تلجاپرشاد، راجہ کالکا پرشاد، راجہ جی رام راؤ، راجہ رنک راؤ، راجہ نانک رام، راجہ گیان چند، راجہ بالمکند، راجہ ماکھن لال، راجہ گوبند نارائن، راجہ اسونت راؤ، راجہ مکٹ رام، راجہ مرلی دھر، راجہ بشن سنگھ، راجہ سکہ لال، رائے چونگی رنک راؤ، رائے لچھمن داس، یہ چند نام ہیں اور یہ وہ بااختیار راجہ ہیں جن کا عہدہ اور دبدبہ کئی کئی نسلوں تک جاری رہا۔ ان سب کو کامل اختیار تھا کہ وہ مندر بنائیں یا مسجد اور تہواروں کو پوری مذہبی آزادی سے منائیں، یہاں ہم تفصیل سے گریز کرتے ہیں جس کو دلچسپی ہو وہ تاریخ گلزار آصفیہ ہی دیکھ لے جو میر عثمان خاں سے پہلے میر محبوب علی خاں کے عہد میں لکھی گئی، اسی لیے اس میں مہاراجہ کشن پرشاد جیسے نہایت بااختیار ہندوؤں کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ ورنہ گلزار آصفیہ کی خوشبو اور اس کے رنگوں کی بہار اور بھی دلنواز ہو جاتی۔

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری اور ہندوستان سے محبت اور شیفتگی کی داستانوں کے لیے معروف تاریخی کتابوں کی گواہی ہی کافی ہے، لیکن وہ چھوٹی چھوٹی کتابیں جو مختلف علاقوں کی تمدنی و تہذیبی داستانیں سناتی ہیں، ان کا مطالعہ شاید بڑے مورخین کی کتابوں سے کم اہم نہیں۔

حیدر آباد کے تعلق سے ایسی مختصر کم نام اور اب گم نام کتابیں تعداد میں کم نہیں۔ جو مسلم حکمرانوں کی حقیقت کی آزادی اور ایمانداری سے تصویر پیش کرتی ہیں۔ جیسے رائے محبوب نرائن کی چونسٹھ صفحات کی چھوٹی سی کتاب گذشتہ حیدر آباد ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ کتاب دکن کی تاریخ اور تہذیب کے

ان پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے جو عام طور سے نگاہوں سے اوجھل تھے۔ محبوب نرائن جتنے صاحب طرز ادیب تھے اس سے کہیں زیادہ وہ گنگا جمنی تہذیب اور شائستگی کا نمونہ تھے، تاریخ دکن پر گہری نظر تھی۔ یہ احساس میر عابد علی خاں کا ہے۔ خود محبوب نرائن کا کہنا ہے کہ حیدر آباد کی ان بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنا ہے جہاں نیند کے ماتے انسانوں کو بھیرویں کے مدھر سُر بھرے گیتوں سے جگایا جاتا تھا۔ یہ بھیرویں اور یہ گیت کیا تھے، کاش آج تعصب، نفرت، انتقام کی آوازوں سے پر شور ماحول ان کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

کتاب گذشتہ حیدر آباد، انشائیہ نگاری کے رنگ میں ہے، جہاں تاریخ کی زبان کی خشکی اور درشتی کی جگہ، لہجے کا البیلا پن ہے، محبوب نرائن نے حیدر آباد کے ذکر کا آغاز تین مشہور فارسی شعروں کی ترجمانی سے کیا کہ: ''شہر حیدر آباد فرخندہ بنیاد حسن وخوبی میں ہشت بہشت ہے..... شہر کی سیر حیات بخش ہے، فن وخوبی سے کم درجہ کی کوئی شے یہاں نہیں ہے۔ نہیں ہے تو بس غم نہیں ہے۔ اللہ کا دیا کچھ کم نہیں ہے، سب کچھ ہے اور سب کے لیے ہے.... چار مینار پر ایک مکتب بھی ایک مسجد بھی، اندر کچھی کا مندر.....''

محبوب نرائن کے اس مرقع میں دولارائے کی ڈیوڑھی ہے، دیوی کے بھگت لالہ بہادر میں، ماتھر کائستھوں کی بستی یعنی دانشوروں کی بستی ہے۔ نظام کہنہ کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''نئے دور نے نظام کہنہ کو توڑھا دیا مگر تعمیر نو کے نقوش ابھار نہ سکا، رسم ورواج، عادات واطوار، معاشرہ یہ سب پشت ہا پشت کے طویل تجربات کی تاریخ پر منحصر ہوتے ہیں، حیدر آباد کا سارا ماحول ادب آموز تھا۔۔۔۔ ہر جگہ رکھ رکھاؤ اور اخلاص ومروت، یہی تو قومی کردار سازی کا سرچشمہ تھا''۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد کے ذکر میں لکھ دیا کہ مہمات سلطنت کا مدار ظل اللہ کے نام پر مدار المہام کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے ذکر میں رتن ناتھ سرشار، موہن لال، ہیرالال سب موجود ہیں، راجہ راجندر گوتم راؤ بھی ہیں جن کے پاس سنسکرت کے پنڈت جمع ہیں۔ راجہ راجیشور راؤ، راجہ بنسی راجہ، مالک راؤ، وٹھل راؤ سب جمع ہیں اور کہیں بھی ان میں اور نواب بہادر جنگ میں کوئی فرق نہیں۔ جہاں حسن نظامی کی تکریم ہے وہیں بھنڈاری مہاراج کی تعظیم ہے۔ بابا پورن داس کی آؤ بھگت ہے تو دنڈی سوامی کا احترام بھی ہے۔ رائے محبوب نرائن حیدر آباد کے ذکر سے سرشار ہی نہیں بے خود ہو ہو جاتے ہیں، حیدر آباد کی تہذیب کے عنوان سے جو لکھا وہ نثریہ شاعری کا شاہکار ہی کہا جائے گا، یہاں اس کی ادبیت کو پیش کرنے کی گنجائش نہیں، بس نظر ان جملوں پر ٹھہرتی ہے کہ ''یہاں کلیلیں کرتی گنگناتی ندیاں نہیں،

یہاں تو پیار اور پریم کے گنگ وجمن کی ملی جلی تہذیب کی لہریں مارتے ساگر ہیں۔ کتنی تہذیبوں کا سنگم ہے یہ شہر''۔

جس شہر میں مسلمان حکمراں ہولی جیسے تہوار میں خود اعلان کرتے ہیں کہ ''آداب برخواست، بے تکلف رنگ مناؤ'' اسی کی بربادی کا جشن یوم نجات کی شکل میں منایا جانا کسی ملک و قوم کی بدبختی اور اس سے کہیں زیادہ انسانیت کی تذلیل نہیں تو اور کیا ہے؟

رائے محبوب نرائن دکن کے محرم کے بھی محرم اسرار ہیں، ان کے قلم سے حیدرآبادی محرم کیوں محروم رہتا، شروع ہی کیا اس شعر سے کہ:

عجیب یہ داستاں ہے غم کی مشکل   کہ بسم اللہ میں بسمل ہوا دل

آگے جو لکھا وہ تو بس اصل کتاب ہی میں پڑھنے کے لائق ہے۔ یہاں تو صرف اپنے مقصد کے لیے بعض جملوں کو قند مکرر بنا سکتے ہیں، مثلاً یہ کہ ''عہد قطب شاہی میں محرم کو ایک سلیقہ سے اہمیت حاصل ہوگئی کہ دکن میں محرم کا احترام کسی مذہبی فرقہ یا برادری کی اجارہ داری نہیں رہا، اس کو قومی تقریب کا درجہ حاصل ہوگیا۔۔۔۔ محرم نے دکن میں فرقہ، گروہ، جتھابندی، مذاہب اور عقائد کی دیواریں ڈھادیں اعلیٰ ادنی ہندو مسلم ایک علم تلے جمع ہوگئے، جلوس میں سکھ فوجی بھی ہوتے، ست سری اکال کے نعرے لگاتے، سکھوں کی جمعیت نیلے شملے میں کیس لپیٹے، کرپان باندھے تلوار لٹکائے سیاہ پوش سردار جی لوگ رنگیلے گھوڑے پر سردار موہن سنگھ۔

آصفی حکومت میں رعایا اپنے مذہب پر کس طرح عامل تھی اس کا اندازہ بھی ان سطروں سے کیا جاسکتا ہے کہ ''لوگ منگم لنگم پوجتے ہیں، اپنے نندی بیل کو جھول ڈال کر سینگ پر چاندی کی سنگھوئی پہنا تے، پاؤں میں پازیب سجائے خوشیاں لٹاتے، دعائیں دیتے پھرتے ہیں''۔ رائے محبوب نرائن یہ کن لوگوں کی تصویر کشی کرتے ہیں؟ اگر جواب کی ضرورت ہے تو ایک مورخ کی زبان کہتی ہے کہ حیدرآباد دکن کا آغاز ہی ہندو مسلم میل جول اور یگانگت کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے یہ بات اس وقت کہی جب حیدرآباد پولیس ایکشن سے ایک نئے انقلاب سے دوچار ہوا۔ اس وقت انہوں نے ضرورت سمجھی کہ حیدرآباد اور مملکت آصفیہ کی تاریخ اور اس کی روایات کو ایک بار پھر سے پیش کردیا جائے تاکہ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ حیدرآباد مذہب وملت اور زبان و نسل کی رنگارنگی کے باوجود کس طرح صدیوں سے امن واعتماد، باہمی رواداری اور یک رنگی کا مخزن ومرجع رہا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اسی مقصد سے کتاب فرخندہ بنیاد حیدرآباد لکھ دی۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہی اصلاً سچی تاریخ کا سب

سے معتبر ماخذ ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب جانکی پرشاد کی عصر جدید ہے اس کا مطلب بھی سرورق ہی پر واضح کر دیا گیا کہ عہد عثمانی میں حیدر آباد دکن کی ترقیوں کا اجمالی بیان۔ قریب سو صفحات کی یہ کتاب اس ماحول سے بالکل جدا ہے، جہاں عیش و عشرت اور شعر و موسیقی کی جلوہ گری ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں سلطنت کے نظم و نسق، وضع، قوانین اور ان کا نفاذ، تعلیمات، تعلیمی عصر جدید، تاسیس جامعہ عثمانیہ، نستعلیق ٹائپ، مالیاتی اصلاحات، آثار قدیمہ، صنعت و حرفت، نظام ریلوے، آب پاشی، تعمیرات، سڑکیں، آرائش بلدہ، طبابت، پولیس، عدالت، پٹہ اور سکہ، فوج جیسے نظام حکومت کے اہم اجزا کا وہ بیان ہے جو ایک بیدار مغز حکمراں اور اس کے مشیران کار کی سوچ اور ہمت دونوں سے تعارف کراتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں سر اکبر حیدری کی قابلیت کا ایک نمونہ یہ بتایا گیا کہ مالیہ کے میزانیہ کی خوبی سے اعلیٰ پیمانہ پر تجارتی، صنعتی اور تعلیمی ترقیوں کو جاری رکھا گیا، اس وقت ساری دنیا میں کساد بازادی تھی لیکن دکن میں مصارف میں کسی قسم کی تخفیف کے بغیر عوام کی فلاح و بہبود اور مادی ترقی کی ہر اسکیم کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ نظام دکن کا یہ کارنامہ زریں بتایا گیا کہ مملکت کے جمع و خرچ میں کئی گنا اضافہ ہوا۔

جانکی پرشاد نے محکمہ آثار قدیمہ کے متعلق لکھا کہ اس محکمہ نے ایلورا اور اجنتا کے غاروں کو صاف ہی نہیں کرایا، نئے غار بھی دریافت کیے، بیدر اور اورنگ آباد کی مشہور عمارتوں کو شکست و ریخت سے بچانے کے ساتھ ورنگل، شوراپور کی مشہور ہندو عمارتوں اور مندروں کو بھی درست کرایا۔ اسی ضمن میں یہ بھی لکھا کہ عبادت گاہیں ہوں یا تعلیمی ادارے ہوں، نظام کا فیض سب کے لیے عام اور برابر تھا۔ آر ایس داس کی جدید تعلیمی اسکیم کی تکمیل کے لیے دو لاکھ روپے، ڈاکٹر ٹیگور کی وشو بھارتی کے لیے ایک لاکھ روپے بطور مثال ہیں۔ قریب سو سال پہلے ان رقموں کی قیمت آج کے کروروں سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے، اسی لیے جانکی پرشاد شاہان آصفیہ کی رواداری اور بے تعصبی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''اس کی نظیر کسی اور سلطنت میں نہیں مل سکتی''۔

تعلیمات کے باب میں یہ بیان بھی آج کے ماحول میں بار بار پیش کیے جانے کے لائق ہے کہ ''برطانوی حکومت ہند تینتیس کرور رعایا کے تعلیمی اغراض پر سات کرور سالانہ خرچ کرتی ہے اور مملکت آصفیہ میں نظام اپنی ڈیڑھ کرور رعایا پر ایک کرور سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ ہندوؤں، عیسائیوں کے پرائیوٹ تعلیمی اداروں کو بھی حکومت آصفیہ ماہانہ یا سالانہ امداد دیتی رہتی ہے۔ کسی خاص مذہب یا قوم سے قطع نظر نظام تعلیم کو ہر قوم اور مذہب کے لیے وسیع کر دینے سے نظام نے عملی طور پر ایک ملکی قومیت کی داغ بیل ڈالی''۔ یہ باتیں جانکی پرشاد کے قلم سے نکلی ہیں، جو بظاہر ایک چھوٹی سی کتاب

کی شکل میں ہیں، لیکن بڑی بڑی تاریخ کی کتابوں کے لیے شاید یہ مستند ترین ماخذ ہے۔ چوں کہ ہمارا خاص مقصد مذہبی رواداری کے واقعات کو دیکھنا ہے، اور وہ بھی ایک ہندو کی نظر سے، اس لیے حکومت کے اور تمام اداروں سے قطع نظر مذہبی رواداری کا ذکر زیادہ مقصود ہے۔ جانکی پرشاد لکھتے ہیں کہ ''مملکت آصفیہ کی بے تعصبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم ادارات مذہبی جن میں مندر، دھرم شالے، گوشالے، یاترا، رتھوں کے جلوس، دیو کے جلوس، پروہت، نجومی، برہمنی، بھگت استھان، گرو کی مدد معاش، کتھا کہنے والے، گرجا، آتشکدے، گرودوارے شامل ہیں۔ تعداد میں تقریباً بارہ ہزار ہیں جن کو سرکار سے تنخواہ، یومیہ معمول، انعام وغیرہ مقرر ہے۔ اس کے برخلاف مسلم ادارے تعداد میں کل پونے پانچ ہزار ہیں جن کو سرکار سے تنخواہ، یومیہ یا انعام ملتا ہے۔ علاوہ اس فیاضی کے بہت سے عظیم الشان ادارات ہنود وہ ہیں جن کو ہزاروں اور لاکھوں کے دیہات بطور جاگیر مدد معاش وا گرہار دیے گئے ہیں''۔

یہی نہیں جانکی پرشاد کا قلم یہ بھی لکھتا جاتا ہے کہ ''آصف جاہی حکومت میں حاکم و محکوم اقوام کے درمیان کوئی مذہبی حد فاصل نہیں رہی، لیکن نظام سابع نے چند قدم آگے بڑھ کر اپنی رعایا کی دلجوئی اس طرح فرمائی کہ اپنے قلمرو مملکت میں گاؤکشی کی ممانعت فرمادی۔ یہ واقعہ عہد عثمانی کی وہ مستقل یادگار ہے جو ہنود کے دلوں پر نقش ہے اور کبھی نہ مٹے گی''۔

ریاست حیدرآباد کے تعلق سے یہ چند باتیں اس لیے بھی مطالعہ کے لائق ہیں کہ یہ نہایت معتبر لکھنے والوں کی وہ تحریریں ہیں جو تاریخ کی معروف کتابوں میں شامل نہیں۔ مختصر صفحات میں یہ بہرحال ایسی سچائیاں ہیں جن سے واقف ہونے کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کتابوں کے حوالے مضمون کے درمیان نہیں دیے گئے۔ ذیل میں البتہ بطور کتابیات ان کو درج کیا جاتا ہے۔

کتابیات:

۱۔ گلزار آصفیہ، خواجہ غلام حسین خاں المخاطب بہ خان زماں خاں، مترجم: محمد قمرالدین صابری، ایچ ای ایچ نظام حسن اردو ٹرسٹ، حیدرآباد، ۲۰۰۸ء۔

۲۔ حیدرآباد، ماضی کے جھروکوں میں، مرتبہ خواجہ معین الدین عزمی، حیدرآباد، ۲۰۰۵ء۔

۳۔ گذشتہ حیدرآباد، رائے محبوب نرائن، ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد، ۱۹۸۵ء۔

۴۔ فرخندہ بنیاد حیدرآباد، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، کتاب گھر حیدرآباد، ۱۹۵۲ء۔

اردو کو کیسے بچائیں

ڈاکٹر ظفرالاسلام خان

اردو پہلے ہندی اور ہندوی کے نام سے جانی جاتی تھی۔اس کی تاریخ امیر خسرو سے شروع ہوتی ہے جنھوں نے تقریباًایک ہزار سال پہلے ایک دوہے میں کہا: ''بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی''جو نہ صرف ضرب المثل ہے بلکہ اسے آج بھی بغیر کسی مشکل کے سمجھا جاسکتا ہے۔ شہنشاہ شاہ جہاں نے اس زبان کو ''اردوئے معلی'' کا نام دیا جو بعد میں صرف اردو رہ گیا۔اردو بمعنی فوج ایک ترکی لفظ ہے جو آج بھی مستعمل ہے۔ ''اردو'' سے مراد وہ ملی جلی زبان ہے جو لشکر میں مختلف زبانوں کے بولنے والوں میں دھیرے دھیرے رائج ہوئی۔اس طویل عمل سے ایک بہت شیریں اور لچکدار زبان ابھری جس میں مختلف مسائل و مضامین بڑی آسانی سے بیان کئے جاسکتے ہیں۔

اسی اردو زبان کی بدولت جنگ آزادی لڑی گئی۔آزادی سے پہلے بر صغیر کے سارے بڑے اخبارات اسی زبان میں نکلتے تھے۔ ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ اسی زبان نے دیا۔ لیکن ہندوستان سے آزادی کے بعد اس زبان کو دیش نکالا دے دیا گیا اور علی الاعلان پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں کہا گیا کہ جس کو اردو بولنی ہو وہ پاکستان جائے۔پاکستان نے ضرور اس زبان کو گلے لگایا اور ترقی دی، لیکن ڈر لگتا ہے کہ لسانی عصبیت اس کو وہاں سے بھی نہ نکال دے جیسے اسے مشرقی بنگال سے نکال دیا گیا حالانکہ ایک زمانے میں ڈھاکہ کے شرفاء کے گھروں میں اردو بولی جاتی تھی۔اس کی ایک جھلک مجھے مغربی بنگال کے شہر مرشدآباد میں چند سال قبل ملی جب میں نے ایک نوابی خاندان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں شستہ اردو بولتے دیکھا جبکہ باہر سڑکوں پر عام بنگالی مسلمان نہ صرف اردو نہیں بولتے ہیں بلکہ آسان اردو یا ہندی بھی بمشکل سمجھ پاتے ہیں۔

اردو اب مشاعروں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔چند سال قبل ایک ریاستی اردو کمیٹی کے سربراہ نے فخر یہ کہا تھا کہ وہ اب تک کوئی پونے دو سو مشاعرے کرا چکے ہیں۔ مشاعروں میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن ان سے اردو زبان بچنے والی نہیں ہے۔ہمارے وہ گھرانے جہاں صرف ایک نسل پہلے شستہ اردو بولی جاتی تھی،اب وہاں بچے، بلکہ ماں باپ بھی،انگریزی بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فی الحال جو کچھ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اردو کے لئے ثقافتی اور تعلیمی طور پر کر رکھا ہے، ہم

موجودہ سیاسی ماحول میں اس سے زیادہ کی توقع نہیں کر سکتے ہیں۔اردو بچانے کی کنجی صرف ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ضرورت ہے کہ اس زبان کو ہم کم از کم اپنے گھروں میں زندہ رکھیں۔اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں تعلیم دلائیں جہاں کم از کم بحیثیت ایک مضمون کے اردو کی تعلیم ہوتی ہو۔اردو اخبارات، مجلات اور کتابیں خرید کر پڑھیں۔ فلسطین میں یہودیوں نے ۱۹۱۸ کے بعد بغیر کسی سرکاری مدد کے ایک مردہ زبان یعنی عبرانی کو زندہ کر دیا بلکہ عبرانی کے ایک ادیب شموئیل یوسف اگنون کو ادب میں نوبل انعام بھی ۱۹۶۶ میں مل چکا ہے۔

ہندی والوں نے بھی کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ایجاد کی ہوئی ایک مصنوعی زبان کو تعصب کے ساتھ نہ صرف اپنایا بلکہ آج اسے پورے ہندوستان پر تھوپ چکے ہیں۔اس زبان کی حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ میں بعض ہندوؤں کے مطالبے پر انگریز گورنر نے صوبہ یونائیٹڈ پراونسیز (موجودہ یوپی) میں دوسری زبان کے طور سے سرکاری دفتروں میں استعمال کی اجازت دے دی جبکہ پہلی زبان اردو تھی۔اس کے برعکس ہم ایک زندہ زبان کو اپنے رویے سے زندہ در گور کرنے کے درپے ہیں۔مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم وہ آخری پیڑھی تو نہیں ہیں جس کے بعد اردو صرف کتابوں اور میوزیم میں رکھے طغروں اور لائبریریوں میں سجی ہوئی کتابوں میں زندہ رہے گی۔ہمارا آج کا فیصلہ اس سوال کا جواب دے گا۔

کچھ لوگ اردو بچانے کے لئے اس کے رسم الخط کو بدلنے کی بات کرتے ہیں۔میرے خیال میں یہ قطعاً کوئی حل نہیں ہے۔اردو کا وجود اور تلفظ اس کے رسم الخط سے وابستہ ہے۔اردو کا رسم الخط ایک زندہ وجود ہے جس میں ہر لفظ، ہر آواز اور ہر تعبیر کی اپنی جگہ اور ایک تصوراتی وجود ہے۔دیوناگری یا رومن رسم الخط میں لکھنے سے وہ زندہ الفاظ اور تعبیرات بولنے والے کے لئے بے معنی اور مردہ ہو جائیں گے ۔جن زبانوں کا رسم الخط بدلا گیا ہے، جیسے ترکی زبان یا مالے (ملیشیا اور انڈونیشیا کی زبان) تو وہاں کی نئی نسل آج پوری طرح سے اپنے صدیوں پرانے ورثے اور لاکھوں کتابوں اور کروڑوں دستاویزات سے محروم ہو چکی ہے۔دوسرے لفظوں میں وہ اپنے ماضی سے کٹ چکی ہے۔ہم بالکل نہیں چاہیں گے کہ ہماری آنے والی نسلوں کا حشر بھی کچھ ایسا ہو۔اس کے لئے ہمیں خود اپنے گھروں میں اردو کو محفوظ رکھنا ہوگا۔اپنے بچوں کو ایسے اسکول میں داخل کرائیں جہاں کم از کم ایک مضمون کے طور سے اردو پڑھائی جاتی ہو۔گھر میں اردو بولیں، اپنے بچوں کو کم از کم گھر میں ضرور اردو پڑھائیں اور اردو اخبارات، رسائل اور کتابوں کو خریدیں تاکہ اردو کا تعلق زندگی سے قائم رہے۔اگر آپ اردو کتابوں اور جرائد کو خرید کر نہیں پڑھیں گے تو ان کو چھاپنے پر کون پیسہ خرچ کرے گا؟

اخبار علمیہ

قاضی نذرالاسلام کے تمام کاموں کا ہندی میں ترجمہ

پریم چند لٹریری انسٹی ٹیوٹ (پی ایل آئی) نے آسنسول میں قائم قاضی نذرالاسلام یونیورسٹی کے ساتھ ایک مشترکہ محضر نامہ پر دستخط کیا ہے۔اس کے مطابق جلد ہی بنگال کے مشہور شاعر اور مجاہد آزادی قاضی نذرالاسلام کے تمام ادبی کاموں کا ہندی میں ترجمہ کرایا جائے گا۔پریم چند ادبی ادارہ کے ڈائریکٹر پروفیسر سدانند شاہی نے اس کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا: قاضی نذرالاسلام بنگال کے نامور شاعر اور مصنفین میں تھے۔ان کے کارناموں کا مستند ہندی ترجمہ ادبی ورثے میں اہم کردار ادا کرنے میں معاون ہوگا۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران نوجوانوں میں ان کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے برطانوی حکومت نے ان کے شعری مجموعے ''اگنی وینا'' پر پابندی عائد کردی تھی اور انہیں بھی قید کر دیا تھا۔ پروفیسر شاہی جو ادبی میگزین ''سخی'' کے ایڈیٹر ہیں نے بتایا کہ وہ قاضی نذر الاسلام کے لیے میگزین ''سخی'' کا ایک خصوصی ایڈیشن شائع کرکے اس اہم پروجیکٹ کو شروع کرنا چاہتے ہیں۔پروفیسر سدانند شاہی اور پروفیسر دیباشش بندیواپادھیائے وائس چانسلر قاضی نذرالاسلام یونیورسٹی، آسنسول اس منصوبے کی نگرانی کرنے کے لیے تیار ہیں جس کا مقصد قاضی نذرالاسلام کے کاموں کے مستند تراجم کے ذریعے ہندی ادب کو مالا مال کرنا ہے۔انہوں نے کہا کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے ایک ڈرامہ ''وسنت'' کو انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کے نام وقف کیا تھا۔بنگلہ دیش نے نذرالاسلام کو اپنا قومی شاعر قرار دیا ہے۔ قاضی صاحب نے مذہبی اور ثقافتی حدود سے اوپر اٹھ کر ہندو اور مسلمان کو اپنی دو آنکھوں سے تعبیر کیا ہے۔امبیڈکر ایجوکیشنل یونیورسٹی، کولکاتا، ہندو یونیورسٹی، ہلدیہ کے متعدد نامور اسکالرس نے تعاون پر مبنی پہل کی ہے۔(ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ۱۰ ستمبر ۲۰۲۳ء ص ۳)

ک، ص اصلاحی

تبصرہ کتب

مہاتماگاندھی، سماجی انصاف پسندی اور اردو: از پروفیسر عبدالستار دلوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۰۸، قیمت : ۲۵۰ روپے، پتہ : نوبل ایجوکیشنل اینڈ سوشل ٹرسٹ ممبئی اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ممبئی وغیرہ، سن اشاعت ۲۰۲۰ء، موبائل: ۸۴۵۴۸۴۵۵۵۲

مہاتما گاندھی کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظریات میں اردو اور ہندی کی لسانی شناخت اور ان کی ملکی حیثیت اور اہمیت پر بعض خیالات ہیں، جن کے متعلق مختلف رائیں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہیں، اردو کو ہندوستانی نام دینے کی غالباً سب سے پہلے یا سب سے زیادہ مدلل وکالت مولانا سید سلیمان ندوی نے کی تھی، اس کتاب میں کہا گیا کہ گاندھی جی نے یہ نیا نظریہ پیش کیا۔ حالاں کہ دونوں کے دلائل اور مقاصد میں جو بنیادی اختلاف ہے اس پر بھی اظہار خیال ہوتا رہا۔ اس کتاب میں مصنف نے مہاتما گاندھی کی ہندوستانی کو اردو+ ہندی= ہندوستانی والا فارمولا بتایا ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی گئی کہ آخر آخر گاندھی جی کو یہ احساس ہوا کہ مستقبل میں اردو کو نظر انداز کر کے ہندوستانی سیاست کا ایک خطرناک پہلو سامنے آسکتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس کے لیے اس خط کو بنیاد بنایا جو گاندھی جی نے انتقال سے انیس روز پہلے لکھا تھا اور جو آج بھی نہرو میموریل لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ اور اس قسم کے کئی مضامین فاضل مصنف نے وقتاً فوقتاً لکھے۔ بقول مصنف گاندھی جی کی تعلیمات اور افکار وخیالات کا جائزہ سکون قلب اور فرحت دل وجگر کا باعث بنا ہے، کیوں کہ ان کا سارا محور اخلاق ومحبت ہے، گاندھی جی کی تعلیمات کی عصری معنویت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اردو ہندی کا مقام بھی اسی تناظر میں کئی بار دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وکالت بہر حال وکالت ہے۔ مصنف نے اپنا یہ فیصلہ بھی سنادیا کہ ہندوستانی کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ وہ اردو اور ہندی کی نفی کرتی ہے یا وہ ان دونوں کے خلاف ہے، اردو ہندی کی حیثیت دو ادبی اسالیب کی ہے جو آزادانہ حیثیت سے پروان چڑھیں گے۔ اس وضاحت کی معقولیت زمانہ نے جس طرح ظاہر کی وہ وقت کا ایسا فیصلہ ہے جو الگ سے بحث کا طالب ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اپنی جدا اہمیت رکھتی ہے، گاندھی اور ہندوستانی زبان اور سماجی انصاف پسندی کے تعلق سے عمدہ معلومات کی جب بھی ضرورت ہوگی اس کتاب کی افادیت اپنی اہمیت کا اقرار کرائے گی۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

برہان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات: از ڈاکٹر عارف انصاری متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۲۵، قیمت ۲۵۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۱۸ء، پتہ: رشید بک ڈپو، منڈی بازار، برہان پور، ایم. پی، موبائل: ۹۷۵۵۵۶۲۱۵۹، موبائل مصنف: ۹۰۰۹۲۱۳۰۵۸

اسلامی ہندوستان کی تاریخ کے عنوانوں نے بعض مرکزی سلطنتوں سے زیادہ اہم اور عظیم الشان حکومتوں پر بے توجہی کا پردہ ڈال دیا۔ ایسی ہی ایک حکومت خاندیش کے فاروقی شاہوں کی تھی جس نے وسط ہند میں ست پڑا پہاڑی سلسلہ کے نہایت پر پیچ اور دشوار گزار علاقہ کو تہذیب و تمدن اور علم وادب کی ایسی سرسبزی و شادابی بخشی جس کے آثار و نقوش آج بھی پرکشش ہیں۔ برہان پور کا خطہ جغرافیائی لحاظ سے باب دکن کہلاتا ہے۔ جنوبی ہند کی تسخیر کے لیے برہان پور کی رضامندی، شمال کے حوصلہ مندوں کے لیے ناگزیر تھی۔ برہان پور کی تاریخ بعض حیثیتوں سے دلی و حیدرآباد سے زیادہ پر شکوہ ظاہر ہوتی ہے۔ قریب ساڑھے چھ سو سال پہلے شیخ برہان الدین غریب کے نام پر اس شہر کو آباد کیا گیا، نیت کی برکت تھی کہ اس شہر کو محدثین کرام سے خاص نسبت حاصل ہوئی۔ علماء و صلحا کی برکت نے اس کو مدینۃ الاولیا کا نام دیا ساتھ ہی شعر و ادب میں بھی اس شہر نے اپنی انفرادیت ثابت کی، اردو زبان کے وجود کے ابتدائی نقوش سعدی دکنی کی شکل میں ساتویں صدی ہجری میں اسی برہان پور کے آس پاس تلاش کیے گئے۔ ریختہ میں سعدی کی اولیت پر بہتوں کو یقین ہے، بعد میں اسی سلسلے میں شیخ علی متقی منصور، مجذوب اور شاہ عیسی جند اللہ جیسے ناموں سے برہان پور میں دکنی ریختہ یا اردو شاعری کے سفر کی منزلیں پہچانی گئیں۔ اردو شاعری کی اسی ابتدا، ارتقا اور پھر دور حاضر کی منزل انتہا تک کے جائزے کی عمدہ اور جامع کاوش زیر نظر کتاب کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ جدت یہ ہے کہ اس آخری منزل سے ایک الگ راستہ یوں نکالا گیا کہ دبستان لکھنؤ کا رشتہ برہان پور کی شاعری سے جوڑ کر دلچسپ انداز میں لکھنوی اثرات کی نشان دہی کی گئی، اس کام کے لیے علم و تحقیق کے ساتھ ذوق و مزاج کی اپنی اہمیت ہے، فاضل مصنف نے ثابت کیا ہے کہ یہ نعمت ان کو کم نہیں ملی، انھوں نے کئی نامور اساتذہ سخن اور ان کے حلقہ اثر کی روشنی میں اس جائزہ کی تکمیل کی۔ محاورہ بندی، تشبیہ، تلمیح، تضاد و تکرار لفظی وغیرہ صنائع و بدائع کے بیان میں پیش کیے گئے اشعار کا انتخاب بھی قابل داد ہے، مثلاً لکھنؤ سے سینکڑوں میل دور برہان پور کے غالب ہاشمی کا ایک شعر ہے:

آئے ہیں آج ڈال کر چہرے پہ وہ نقاب — جزدان میں لپیٹ دی اللہ کی کتاب

ایسے کچھ اور شعر:

سزا وار خطا پہ یہ کرم کیوں — نہ جانے آپ کے ہیں کیا ارادے
مصحف رخ کو ہتھیلی کے رحل پر رکھ کر — آپ اپنے کو وہ ہر روز پڑھا کرتی ہے
نوک مژگاں کی چھیڑ کے صدقے — میرے دل سے یہ گدگدی نہ گئی

اس قسم کے اشعار کے علاوہ وہ رنگ بھی نمایاں ہے جو لکھنؤ سے زیادہ دہلی کی پہچان ہے اور کتاب میں اس کے اظہار سے اجتناب بھی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے صرف ماضی ہی نہیں، حال کے برہان پور کی انفرادیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اپنے موضوع پر یہ تحقیقی مقالہ آنے والے محققین کے لیے بہترین مرجع و ماخذ ثابت ہوگا۔ تحقیق میں وسعت و دقت نظر شامل ہو جانے کے بعد تلاش و جستجو کا اعلیٰ معیار مدنظر ہو تو پھر موضوع سے انصاف کرنے کی خوبصورت مثال سامنے آ ہی جاتی ہے۔ (ع۔ص)

خطوط شبلی بنام شروانی: ترتیب وتدوین فیصل احمد ندوی۔ کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۷۴، ملنے کا پتہ: حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر: درج نہیں۔ ای میل: khansmr@yahoo.com

پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی مرحوم نے اپنے جد امجد مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے نام اہل ندوہ کے خطوط الگ فائل میں جمع کر رکھا تھا۔ بعض خطوط کرم خوردہ اور نہایت خستہ حالت میں تھے۔ مرتب سے ایک ملاقات کے دوران ان کی اشاعت کی خواہش ظاہر کی گئی تو انھوں نے کمر ہمت کس لی۔ علامہ شبلی کے خطوط کو الگ کیا۔ پہلے سے شائع شدہ خطوط کو سامنے رکھا۔ ان سے مقارنہ کیا۔ بعض خطوط میں الفاظ واضح نہ ہونے کی وجہ سے تحریف یا عبارت بدل گئی تھی ان کی تصحیح کی۔ تصحیح تاریخ میں دوسرے خارجی قرائن سے بھی مدد لی۔ خط میں موجود تقریباً ہر شخص اور کتابوں کا تعارف لکھا۔ اشعار کی تخریج اور عربی و فارسی الفاظ کی تشریح کی۔ تاریخ وار ان کو مرتب کیا یعنی تاریخ کے لحاظ سے ان غیر مطبوعہ خطوط کی جگہ جہاں بنتی تھی وہاں ان کو شامل کیا تاکہ دونوں میں ۱۶ سالہ خط و کتابت کی ارتقائی تاریخ سمجھنے میں آسانی ہو۔ تقریباً ہر خط پر مختصر وضاحتی نوٹ اور حسب ضرورت مفصل حواشی تحریر کیے۔ مجموعہ میں خطوط کی کل تعداد ۱۶۰ ہے جن میں شروانی صاحب کے جمع کردہ غیر مطبوعہ خطوط کی تعداد ۵۸ ہے۔ مرتب کے بقول یہ "خطوط شبلی بنام شروانی" کا سب سے مفصل اور اب تک کی دریافت کے لحاظ سے مکمل اور صحیح ترین مجموعہ ہے (ص ۱۴)۔ صفحہ ۱۷ پر مولانا شبلی کی پیدائش مئی ۱۸۵۷ء لکھی ہے۔ صحیح ۳ جون ہے۔

شروع کے دس صفحات میں مرتب کا گراں قدر مقدمہ ہے جس میں اس مجموعہ کی ترتیب، مکتوب نگار و مکتوب الیہ کے مختصر حالات، مکتوبات کی ادبی و تاریخی اہمیت اور خود اس کی معنویت وغیرہ پر سرسری نگاہ ڈالی گئی ہے۔ بعض ضروری چیزوں کی جانب توجہ بھی دلائی ہے۔ اصل کتاب یعنی خطوط شبلی کا سلسلہ ص ۴۳ سے شروع ہو کر ص ۱۹۰ پر ختم ہوتا ہے۔ ص ۱۹۱ سے ۳۴۲ تک خطوط پر بالترتیب نمبر وار قیمتی

اور اہم حواشی الگ سے تحریر کیے گئے ہیں۔اس کے بعد ۲۰ صفحات پر فہرست مآخذ و مراجع اور تحقیق وحواشی مشتمل ہے۔آخر میں اشاریہ بھی ہے۔مرتب نے بلاشبہ اس مجموعہ کی ترتیب وتدوین میں کمال مہارت کا ثبوت بہم پہنچانے اور اس مجموعہ کو مفید و نفع بخش بنانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔اس کے لیے وہ یقیناً لائق مبارک باد ہیں۔(کلیم صفات اصلاحی)

ایک بے مایہ کا سفر حج: مرتبہ ام یمین ، کاغذ و طباعت عمدہ ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش ۔ صفحات: ۲۳۲۔ملنے کا پتہ: دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ (بہار)۔قیمت: ۲۵۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔موبائل نمبر ۹۰۰۶۳۰۶۰۹۸۔

خانقاہ مجیبیہ اور دارالعلوم مجیبیہ کے ایک صاحب تصنیف صوفی وعالم مولانا شاہ ہلال احمد قادری نے حج کیا تو ان کا یہ دلچسپ اور معلوماتی سفر نامہ ایک بے مایہ کا سفر حج کے نام سے ۲۰۰۶ء میں سہ ماہی المجیب میں نو قسطوں میں شائع ہوا جو بڑے شوق سے پڑھا گیا۔اخفائے حال کے مقصد سے نام کی جگہ رجل من المسلمین لکھا گیا۔اب ان کی صاحب زادی نے اس کو مرتب کر کے اس راز سے پردہ اٹھادیا ہے۔

اردو میں حج کے سفر نامے اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔اس سفر نافہ کی خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے اس میں سفر کی ضروری ہدایات، وسائل، مناسک حج، مکہ، مسجد حرام، مدینہ منورہ وغیرہ کے تاریخی و موجودہ مقامی حالات، قلبی واردات و کیفیات کا تذکرہ بڑے والہانہ، وارفتہ، شگفتہ وشستہ اسلوب بیان اور بڑی سلیس و رواں زبان میں کیا ہے۔جو صفحہ پڑھیے اس سے محبت الٰہی، حب نبویؐ اور الفت اہل بیت کا جام چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔معلومات کا ایک سیل رواں ہے جو بہتا چلا جاتا ہے۔احساس گناہ و معصیت سے دل لبریز مگر امید مغفرت سے معمور ہے۔بعض مختلف فیہ مسائل و مسالک پر بے باکانہ رائیں بھی لکھی گئی ہیں۔بہت سے اشکالات اور غلط فہمیوں کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔مکہ افضل ہے یا مدینہ ؟اس ضمن میں علمائے سلف ابن تیمیہ وغیرہ کے دلائل و نظریات کا جائزہ بھی اس میں نظر آئے گا۔قبر نبوی کی زیارت کے جواز واستحباب کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا ہے۔حیات نبوی کے متعلق بلاحوالہ یہ لکھا گیا ہے کہ "آنحضرت ﷺ کی حیات جسمانی پر جمہور کا اتفاق ہے۔آپ اسی طرح حیات ہیں جس طرح وفات سے پہلے تھے" (ص ۱۸۸)۔اس خیال سے جمہور کا اتفاق محل نظر ہے۔

صاحب سفر نامہ کی لخت جگر مبارک باد کی مستحق ہیں کہ یہ سعادت ان کے حصہ میں آئی۔اس دلچسپ سفر نامہ کو انھوں نے نہ صرف سلیقہ سے ترتیب دیا ہے بلکہ اس پر سفر نامہ کی روشنی میں گراں قدر مقدمہ بھی لکھا۔اس میں عناوین نہیں تھے، قارئین کی سہولت کے پیش نظر موقع کی مناسبت

سے عناوین لکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ پورا سفر نامہ تاریخی و فقہی مواد کا حامل ہے۔ اپنی اسی حیثیت کی وجہ سے سفر نامہ کے بجائے یہ علمی تصنیف کا مقام حاصل کر گئی ہے اور قارئین کو اس میں سفر نامہ اور تصنیف دونوں کی لذت محسوس ہو گی۔ کتاب لائق مطالعہ ہے۔ (ک، ص اصلاحی)

ایم اسلم: بچوں کے ناول نگار، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات: ۶۸۔ ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر: ۹۴۳۰۹۶۶۱۵۶۔ ای میل: info@ephbooks.com۔

مشہور و معروف کثیر التصانیف پاکستانی ادیب، ناول و افسانہ نگار ایم اسلم کو اردو ادب میں "نقاش فطرت" کہا گیا۔ ان کو علامہ اقبال سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آشرم، اشک ندامت، خانقاہ، نمستے علیکم وغیرہ ناولوں اور افسانوں کے درجنوں مجموعے اور آشوب زمانہ، بیتی باتیں، کارزار حیات، اردو ہندی وغیرہ کتابیں ان کے نوک قلم سے نکلیں۔ یہ کتاب بچوں کے لیے لکھے گئے ان کے دو مطبوعہ مختصر ناولوں "رلی کملی" اور "چاندنی" کا مجموعہ ہے جو اب نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔

صاحب کتاب کو ادب اطفال سے بھی دلچسپی ہے۔ اس سے قبل میر تقی میر: بچوں کے شاعر، مرزا محمد رفیع سودا: بچوں کے شاعر، سعادت حسن منٹو: بچوں کے کہانی کار اور عزیز احمد: بچوں کے ناول نگار کے نام سے کتابیں ترتیب دے چکے ہیں۔ ان شعرا و ادبا کو ان کتابوں کے ذریعہ بچوں میں اس حیثیت سے متعارف کرانے کا آغاز مناظر عاشق صاحب ہی نے کیا اور اس میدان میں ان کی کتابوں کو اولیت حاصل ہے۔ اب جب ان کو یہ دو ناول دستیاب ہوئے تو انہوں نے ازراہ ادب پروری و علم دوستی اس کی عام اشاعت ضروری سمجھی۔ ان کے بیان کے مطابق ان ناولوں میں بچوں کی نفسیات، معاشرتی رشتوں کی اہمیت، شعور کائنات، مظاہر فطرت کی رسائی وغیرہ جیسے امور و معاملات کا ادراک ہے۔

ان دونوں افسانوں کو تشبیہات و استعارات اور کنایوں سے بوجھل نہیں بنایا گیا ہے۔ منظر کشی کا پورا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ زبان سادہ، سلیس اور معیاری مگر بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق استعمال کی گئی ہے۔ اس میں ایم اسلم بچوں کے ماہر نفسیات کے طور پر یقیناً نظر آتے ہیں۔

آخر میں شاہد احمد دہلوی کا لکھا ہوا وہ تفصیلی خاکہ بھی شامل ہے جو "چند ادبی شخصیتیں" کے نام سے مجموعہ میں ۱۹۸۳ء میں چھپ چکا ہے۔ اس سے ایم اسلم کی علمی و ادبی خدمات کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ احساس بجا ہے کہ ایم اسلم کی وہ قدر افزائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ کتاب ہر لحاظ سے ذوق شناسان ادب کے لیے مفید ہے۔ ہرگانوی صاحب کا شوق کتاب سازی اس لحاظ سے

قابل قدر ہے کہ نئے نئے موضوعات وعناوین پر کتابوں کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے۔اہل ادب کو ان کا شکر گذار ہونا چاہئے۔

موجوں کا اضطراب۔۔۔آپ بیتی: ڈاکٹر شرف الدین ساحل، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔صفحات:۲۰۸۔ملنے کا پتہ:ساحل کمپیوٹر،حیدری روڈ،مومن پورہ ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸ (مہاراشٹر)۔قیمت:۲۰۰روپے۔سن طباعت:۲۰۲۰ء۔موبائل نمبر:۹۰۲۱۰۶۵۸۳۔ای میل:drmsharfuddinsahil@gmail.com۔

ڈاکٹر شرف الدین ساحل اردو زبان وادب کی جانی پہچانی اور مشہور شخصیت ہیں۔ان کی زندگی علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے گیسو سنوارنے میں گذری۔ان پر ان کی زندگی ہی میں وکرم یونیورسٹی،اجین میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا جاچکا ہے۔یہ آپ بیتی ان پر پی ایچ ڈی کرنے والی مقالہ نگار ڈاکٹر نصرت سلطانہ ہی کے پیہم اصرار پر پہلے ۱۷ابواب میں لکھی گئی۔پھر بعد میں مصنف کے بعض اعزا کے بار بار تقاضہ پر اس میں ترمیم واضافہ کرکے اس کو ۲۷ابواب میں مکمل کیا۔

مصنف کا کہنا ہے کہ انسان کو رزم گاہ حیات میں مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔اس لیے صفحۂ قرطاس پر صحیح حالات بکھیرنا بڑا مشکل ہے لیکن دروغ بیانی،مبالغہ آمیزی اور الزم تراشی سے دامن بچاتے ہوئے انہوں نے جو کچھ ان پر گذری اور جو کچھ دیکھا ہے اسی کو بیان کیا ہے۔دوسرے باب میں اپنے وطن ناگپور کی پوری سیاسی تاریخ محض ڈھائی صفحہ میں سمیٹ دی ہے (ص ۱۵۔۱۷)۔ان کا خاندان تلاش معاش میں برطانوی عہد میں مبارک پور،اعظم گڑھ سے ناگپور منتقل ہوا۔ان کے مطابق ان کی جائے پیدائش مومن پورہ مسلمانان ناگپور کی سیاسی،ثقافتی،علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ آزادی سے قبل کے مشاہیر علما اور تحریک آزادی کے بڑے بڑے سورماؤں کی یہاں آمد رہی۔پھر اپنے خاندان کی قومی وملی سرگرمیوں اور اپنے ذاتی، تعلیمی،ادبی،معاشی اور سیاسی حالات کا ذکر اس قدر پرکشش اسلوب میں کیا ہے کہ ان کے عہد کا پورا ناگپور آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔آپ بیتی کے خاتمہ کے بعد ڈاکٹر نصرت سلطانہ اور نامہ نگار سلیم ظہیر کے مکالمے اور حالات وکوائف اور نگارشات کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی علمی وادبی زندگی کا خاکہ مرتب کتاب محمد رفیع الدین نے شامل کتاب کیا ہے جو محققین کے لیے بڑا کارآمد اور مفید ہے۔

یہ آپ بیتی زبان وزمانہ واہل زمانہ کے مزاج آشنا، کہنہ مشق اہل قلم اور علمی وادبی شہرت کے حامل ایسے شخص کی زندگی کا مرقع ہے جس کے تجربات ومشاہدات سے قاری ضرور استفادہ کرے گا۔اس کے مطالعہ سے انداز کرنا مشکل نہیں ہے کہ موجوں کے اس اضطراب کو خدا نے نہ جانے کتنے طوفانوں سے آشنا کرکے لب ساحل تک پہنچایا ہے۔(ک،ص اصلاحی)

ادبیات

نعتِ حبیب کبریا ﷺ

پروفیسر مقصود احمد مقصود

بڑودا، گجرات

موبائل: ۹۸۲۴۰۳۳۰۱۷

ستم کا دشت ہے عالم یہ سارا یا رسول اللہ
یہاں نیکوں کا مشکل ہے گزارا یا رسول اللہ

مظالم کے اندھیرے غار میں محبوس رہ کر بھی
ہے پر امید بے حد غم کا مارا یا رسول اللہ

مری دنیا سنور جائے، میری عقبیٰ بدل جائے
اگر چشمِ کرم کا ہو اشارا یا رسول اللہ

کوئی خدمت عطا دربارِ روحانی میں ہو مجھ کو
کہ اب دوری نہیں ہر گز گوارا یا رسول اللہ

وہ جس کو اس جہاں میں آپؐ سے سچی محبت ہے
وہی ہے آپؐ کی آنکھوں کا تارا یا رسول اللہ

عمل سے دور ہوں لیکن میں شیدا آپؐ ہی کا ہوں
پھروں کیوں در بہ در پھر مارا مارا یا رسول اللہ

میں کیسے آپؐ کو بھولوں مجھے معلوم جب یہ ہے
مرا ہی بھولنے میں ہے خسارا یا رسول اللہ

خدا سے مانگتا ہوں میں خدا کو آپؐ کے صدقے
کہ وہ مجھ کو ہے جان و دل سے پیارا یا رسول اللہ

زِراہِ لطف مولیٰ سے مجھے اب تو ملا دیجے
ریاضت کا نہیں ہے مجھ میں یارا یا رسول اللہ

مرے بیمار قلب و روح کا دنیائے فانی میں
فقط دیدارِ نورانی ہے چارا یا رسول اللہ

مجھے جب بھی کبھی دیدارِ عالی خواب میں ہوگا
چمک اٹھے گا قسمت کا ستارہ یا رسول اللہ

قوی امید ہے ہوگا مجھے بھی باغِ رِضواں میں
جمالِ حق کا بے پردہ نظارہ یا رسول اللہ

سہارے اس جہانِ پرُ فتن کے سب ہی جھوٹے ہیں
ہے لیکن آپ کا سچا سہارا یا رسول اللہ

مری کشتی بھنور میں ہے عنایت آپ کی گر ہو
تو خود گرداب بن جائے کنارا یا رسول اللہ

گناہوں پر ہے نادم آپؐ کا مقصودؔ بے چارہ
دعائے مغفرت کیجے خدارا یا رسول اللہ

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

نعمانی منزل، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر۔بی، جمال پور۔ علی گڑھ۔ موبائل: ۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷

حبّذا ، رونقِ آرام گہِ سرورِ پاکؐ
جس پہ قربان سبھی قلب و نظر کی املاک

اے خوشا، صلی علیٰ، ذکر رفیع آقاؐ
ایک ایک لفظ نے روشن کیے فکر و ادراک

کیسا باعظمت و رفعت تھا وہ آقاؐ کا سفر
زیر پا آپؐ کے جس شب تھے نجوم و افلاک

’’فاتبعونی‘‘ نے سب پردے ہٹائے دل کے تاجِ کسریٰ
پا گیا رازِ محبت مرا ذہنِ درّاک

کو نہ کیوں روندتے پھر ان کے قدم
وجہِ عزت تھی جنھیں آپؐ کی نعلین کی خاک

آپؐ کے ماننے والوں پہ یہ تہمت ہے غلط
قاتلو! کوئی مسلماں نہیں ہوتا سفّاک

فرق کرتا ہی نہیں عابد و معبود میں جو
کاش پا جائے ہدایت وہ گروہِ بے باک

روضۂ پاکِ نبی دیکھیں گے ان شاء اللہ
ہاں ذرا صبر ابھی اے مری چشمِ نمناک

حد سے باہر مرے آقاؐ کے فضائل ہیں رئیسؔ
بے سند بات ہے البتّہ یہ حرفِ لولاک

غزل

وارث ریاضی

سکٹا (دیوراج)، بسوریا، وایا: لوریا، مغربی چمپارن۔ بہار۔ ۸۴۵۴۵۳۔ موبائل: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

ہر پھول کے ماتھے پہ شکن دیکھ رہا ہوں
افسردگیٔ سرو و سمن دیکھ رہا ہوں

آنکھوں میں ہیں رقصاں غمِ انساں کے مناظر
دل میں غمِ دنیا کی چبھن دیکھ رہا ہوں

پندارِ سیادت میں تشدد کے سہارے
کیا جذبۂ تعمیر وطن دیکھ رہا ہوں؟

تاریخ و ثقافت بھی ہیں نیزوں کی انی پر
مٹتے ہوئے آثارِ وطن دیکھ رہا ہوں

ہیں تیز بہت آتشِ نفرت کی ہوائیں
جلتے ہوئے معصوم بدن دیکھ رہا ہوں

اس دورِ ترقی میں بھی کچھ لوگ ہیں جن کو
دیوانۂ تہذیب کہن دیکھ رہا ہوں

جب سے یہ تعصب کا چلن عام ہوا ہے
اخلاص کو میں سر بہ کفن دیکھ رہا ہوں
کیا بات ہے جو رہبر اعلیٰ ہیں انہیں بھی؟
ناواقفِ آدابِ سخن دیکھ رہا ہوں
شیدائیِ گیسوے معطر ارے توبہ!
ناقدریِ آہوے خُتن دیکھ رہا ہوں
اللہ رے وارفتگیِ دید کا عالم
کانٹوں بھری وادی میں چمن دیکھ رہا ہوں
ناکردہ گناہوں کی سزا کے لیے وارثؔ
ہر موڑ پہ میں دار و رسن دیکھ رہا ہوں

غزل

زاہد جعفری

موبائل:۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸

اشک وخوں سے سینچوں میں درد کا شجر کب تک؟
گل دعا کے مہکیں گے بوُل چشمِ تر! کب تک؟
ٹھہرو ! میں تنِ تنہا ، کود کے سفینے سے
دیکھتا ہوں ! ناچے گا موت کا بھنور کب تک؟
بے زباں سمجھتے ہو؟ خون ہے تو بوُلے گا!
وہ چھپائے گا میرے قتل کی خبر کب تک؟
آگ تو لگادی ہے بستی میں غریبوں کی
تو محل بچائے گا اپنا تاجور! کب تک
مانتا ہوں ! دردِیلی رات لمبی ہے لیکن
روکیں گے اندھیرے گھُپ آمدِ سحر کب تک؟
میری طرح تڑپے گا وہ ، سوال ہے لیکن
کھُل کے راستے دیں گے مصرعۂ اثر کب تک؟
کہہ رہا ہے اِک پنچھی، مر کے ہم بھی دیکھیں گے
بند رکھے گا صیّاد! تو قفس کا در کب تک؟
کوفۂ کدورت میں پرچم غزل لے کر
شانِ کج کلاہی سے زندہ ہوں ! مگر کب تک؟
آدھی رات سے اوپر اب گزر چکی زاہدؔ!
لوٹ کر نہ جاؤگے آخر اپنے گھر کب تک؟

دارالمصنّفین کے لیل ونہار

دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا سالانہ اجلاس ۷، ستمبر ۲۰۲۳ء کی صبح بذریعہ گوگل میٹ ڈاکٹر عبداللہ عامر، رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان (ناظم)، مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، ڈاکٹر سلمان سلطان، ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی، جناب شکیل صبر حدی، پروفیسر علاءالدین خان، انجینئر طارق اعظم اور ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (نائب ناظم) نے شرکت کی۔

تلاوت کے بعد مرحومین بالخصوص دارالمصنفین کے معزز رکن اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور محترمہ صوفیہ صاحبہ اہلیہ ڈاکٹر عبداللہ عامر وغیرہ کے سانحۂ ارتحال پر رنج وغم کا اظہار اور ان سے متعلق تعزیتی تجاویز پیش کی گئیں۔

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی نے گذشتہ سال کی سالانہ میٹنگ کی کارروائی پر عمل درآمد، رفقا اور اکیڈمی کے تمام شعبہ جات کی کارکردگی پر مشتمل تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اکیڈمی کی لائبریری کو درپیش مسائل بالخصوص کرنٹ اسلامی موضوعات اور تاریخ ہند پر شائع شدہ جدید اہم مصادر کتب اور ان کو رکھنے کے لیے کمروں اور الماریوں کی فراہمی کی طرف اراکین کو توجہ دلائی۔

ناظم ادارہ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے اکیڈمی کو درپیش مسائل وامور سے ارکان انتظامیہ کو آگاہ کرتے ہوئے اپنی تفصیلی رپورٹ میں اس کی موقوفہ اراضی سے متعلق یہ خوش خبری سنائی کہ انشاءاللہ یہ مسئلہ بہت جلد حل کرلیا جائے گا۔ ادارے کے مالی استحکام کے لیے انہوں نے کارپس فنڈ کی فراہمی پر زور دیا اور کہا کہ دکانوں اور کانفرنس ہال وغیرہ سے ادارے کی آمدنی میں اضافہ ضرور ہوا ہے لیکن روزافزوں اخراجات کے لیے یہ ناکافی ہے۔ اکیڈمی کو خود کفیل بنانے کے لیے ممبران کی جانب سے یہ تجویز آئی کہ حالات سازگار ہونے پر گرلز ہاسٹل یا انگلش میڈیم اسکول کے قیام سے اس بحران پر قابو پایا جاسکتا ہے لیکن زمینی حقائق پر اچھی طرح غور وفکر کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے۔

اس اجلاس میں مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی کو مجلس انتظامیہ اور ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کو مجلس عاملہ کا صدر اور محترمہ حمیدہ بانو (امریکہ) کو اکیڈمی سے تعلق خاطر اور خصوصی تعاون کے پیش نظر سرپرست اور سابق رفیق دارالمصنفین ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی اور ڈاکٹر محمد خالد اعظمی صدر شعبۂ معاشیات شبلی کالج کو مجلس انتظامیہ کا رکن منتخب کیا گیا ہے۔ مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی صاحب کی دعا پر نشست ختم ہوئی۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

پروفیسر الطاف احمد اعظمی کی ایک قیمتی علمی یادگار

معارف (ستمبر ۲۰۲۳ء) میں ''وفیات'' کے تحت پروفیسر الطاف احمد اعظمیؒ (م ۱۲ اگست ۲۰۲۳ء) کا ذکرِ خیر نظر سے گذرا اور ان کی حیات و خدمات کے مختلف پہلو سامنے آئے۔ مرحوم کی زندگی کا ایک قابلِ قدر پہلو، جیسا کہ مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی صاحب کی تحریر سے بھی سامنے آتا ہے، اللہ رب العزت کی عطا کردہ تقریری و تحریری صلاحیتوں کو مفید کاموں میں صرف کرنا اور علم و علمِ دین کی خدمت کے لیے وقت کا صحیح استعمال کرنا۔ مرحوم کی علمی یادگاروں میں مختلف موضوعات پر ۴۵ سے زائد کتابیں شامل ہیں اور ناچیز کے خیال میں ان کا سب سے قیمتی حصہ قرآنی افکار و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی مطبوعات میں ایک درجن سے زائد کتب اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ ان کی اولین کتابیں (تجلیاتِ حق۔ قرآن اور سائنس کی روشنی میں، ایمان و عمل کا قرآنی تصور، سورۂ فاتحہ۔ ایک تحقیقی مطالعہ، توحید کا قرآنی تصور (مطبوعہ ۱۹۷۸ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء، ۱۹۹۰ء بالترتیب) قرآن سے متعلق ہیں اور عمر کے آخری حصے میں بھی ان کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا خاص محور قرآن ہی رہا ہے۔ فاضل وفیات نگار نے بہت صحیح تحریر کیا ہے کہ ''حقیقت یہی ہے کہ فکر و نظر کا اصل سرچشمہ ان کے لیے ہمیشہ قرآن ہی رہا ہے'' (معارف، ستمبر ۲۰۲۳ء، ص ۶۲)۔ ناچیز کی رائے میں قرآن سے متعلق ان کی بنیادی کتاب ''ایمان و عمل کا قرآنی تصور'' ہے۔ درحقیقت اسی تصور کو صحیح طور پر سمجھنے پر انسان کی فکری و عملی اصلاح کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ ''وفیات'' میں مرحوم کی اہم قرآنی کتب میں اس کتاب کا ذکر رہ گیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف مرحوم کے جونپور شہر میں ایک طبیب کی حیثیت سے پریکٹس کرنے کے زمانہ کی یادگار ہے جو پہلی بار ۱۹۸۶ء میں ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، علی گڑھ کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔ دوسری بار مصنفِ گرامی کی نظرِ ثانی کے بعد یہ مرکزِ تحقیق و اشاعتِ علومِ قرآن، نئی دہلی سے ۲۰۱۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ جدید اشاعت کا تقسیم کار ''مکتبہ الحسنات'' نئی دہلی ہے۔ اس کتاب کی قدر و قیمت کی وضاحت میں نامور عالمِ دین مولانا سید جلال الدین عمریؒ کا تاثر نقل کرنا کافی ہوگا: ''دین نام ہے ایمان اور عمل صالح کا۔ اسلام نے دنیا و آخرت کی تمام خوش خبریاں ان ہی دونوں خوبیوں پر دی ہیں۔ ضرورت تھی کہ علمی اور بالکل فطری انداز میں ان خوبیوں کی بھرپور وضاحت کی جاتی اور ان کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انہیں رفع کیا جاتا۔ ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی کی یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی قیمتی ہے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس میں مصنف نے

بڑے دل نشیں انداز میں ایمانیات کی تشریح کی ہے اور قرآن کے دلائل کو بہترین اسلوب میں پیش فرمایا ہے۔ عملِ صالح ایمان کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ ایمان جب دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو پوری زندگی میں عمل صالح کی بہار آجاتی ہے" (طبع اول، ص ۶)۔

مصنف محترم نے ایمان اور عمل صالح کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت آسان پیرایہ میں ان الفاظ میں واضح کی ہے: "ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں ربط و تعلق کی نوعیت وہی ہے جو ایک عمارت کی بنیاد اور اس کے در و دیوار میں ہوتی ہے، ایمان بمنزلہ بنیاد کے ہے اور عمل صالح بمنزلہ در و دیوار اور ستون کے۔ ہر عمارت اپنے وجود کے لیے بنیاد اور دیوار و ستون دونوں کی محتاج ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو عمارت کا وجود بھی نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح دین کی عمارت بھی نہ تو ایمان کے بغیر قائم رہ سکتی ہے اور نہ عمل صالح ہی کے بغیر کھڑی ہو سکتی ہے" (ص ۱۴)۔ یہ کتاب بہت پہلے سے اِس راقم عاجز کے زیرِ مطالعہ رہی ہے اور اپنی تحریروں میں یہ ناچیز اس سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔ ایمان کی حقیقت، اس کے تقاضوں اور ان کی تکمیل کے فیوض و برکات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بڑی مفید ہے۔

حقیقت یہ کہ جس نے اللہ کا بندہ ہونے کا راز پالیا، مقامِ عبودیت کو سمجھ لیا اس پر انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت منکشف ہو گئی اور وہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لائق بن گیا۔ صاحبِ کتاب نے اسی راز تک رسائی اور اسی مقام کی سمجھ عطا کرنے کی التجاء اللہ رب العزت سے "مناجات" نامی نظم (مشمولہ "چراغِ شب گزیدہ") کے اس شعر میں کی تھی:

ہوں تیرا عبد، مقامِ عبودیت سمجھوں + مجھے تو اپنے کرم سے وہ آگہی دیدے

مرحوم کی اس وقیع تصنیف "ایمان و عمل کا قرآنی تصور" سے متعلق مولانا جلال الدین عمریؒ کا یہ مشورہ بھی لائق توجہ ہے: "ضرورت ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے تاکہ ایمان اور عمل صالح کی روشنی عام ہو، اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ماننے والے اس کے دین کے تقاضے پورے کریں" (ص ۷)۔ مولانا مرحوم کے اس نیک مشورہ پر عمل دونوں مرحومین کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک بہتر صورت ہوگی۔

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
اقرا کالونی، علی گڑھ
zafarul.islam@gmail.com

آزادیٔ ہند میں بنگالی مسلم خواتین کی شراکت

میں بنگلہ دیش سے بندہ عارف خان سعد ہوں۔ میں ڈھاکہ کے ایک مدرسہ میں عربی ادب پڑھاتا ہوں اور روزنامہ ''شوموپر آلو'' کے اسلامی ڈیسک میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرتا ہوں۔ مجھے تاریخ سے، خاص طور پر ہندوستانی تاریخ میں بہت دلچسپی ہے۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی الحمدللہ ہمارے لیے ایک شاندار ادارہ ہے۔ اس تنظیم سے ہمیں بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ میں ماہنامہ معارف باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ ستمبر کے شمارے میں آزادیٔ ہند میں بنگالی مسلم خواتین کی شراکت پر ایک مضمون شائع ہوا، جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر جناب لعل چاند شیخ نے لکھا۔ یہ مضمون مجھے اتنا پسند آیا کہ میں نے اس کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا اور بنگلہ دیش کے قارئین نے اسے بہت پسند کیا، خصوصاً دیندار خواتین نے زیادہ پسند کیا اور شکریہ ادا کیا۔ میں خود اور بنگلہ دیش کے قارئین کی طرف سے مضمون کے معزز مصنف کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مصنف کو شکریہ ادا کریں۔ ترجمہ شدہ کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں آپ کے لیے، دارالمصنفین اور معارف کے لیے دعا کرتا ہوں، اللہ تعالی سب کو امت کی خدمت میں قبول فرمائے۔

عارف خان سعد
مدرس، جامعہ دارالانعام، ڈھاکا، بنگلہ دیش
aksaadbd@gmail.com

استدراک

اگست ۲۰۲۳ء کے شمارہ میں تبصرہ کتب کے ذیل میں فاضل تبصرہ نگار، امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ۔ حیات وخدمات کے تمہیدی کلمات کے ضمن میں لکھا ہے: ''امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا محمد علی مونگیری کے خلف الرشید اور مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی کے مرید تھے'' (ص ۶۹)۔ مولانا منت اللہ کے مولانا گنج مرادآبادی کے مرید ہونے کی بات درست نہیں ہے کیوں کہ جب مولانا گنج مرادآبادیؒ کی وفات ہوئی تو اس وقت تک امیر شریعت رابع پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کی سن پیدائش ۱۹۱۳ء ہے جب کہ مولانا گنج مرادآبادیؒ کی سن وفات ۲۲ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ (۱۲ ستمبر ۱۸۹۵ء) ہے (مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، ۱۳۷۷ھ، ص ۹۴)۔

فضل الرحمن اصلاحی
شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

ایک ہمدرد کا سوال

دارالمصنفین کا اصل علمی کارنامہ آزادی سے پہلے کا ہے۔ اس وقت وہاں اہل قلم بھی تھے اور بھوپال، حیدرآباد جیسی ریاستوں سے مالی امداد خاطر خواہ مل جایا کرتی تھی۔ ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد دار المصنفین سے خاطر خواہ تحقیقی کام نہیں ہوا، جس کا بنیادی سبب یہ رہا کہ وسائل کی کمی کے سبب اہل قلم رفتہ رفتہ رخصت ہوتے گئے، ابو ظفر ندوی، نجیب اشرف ندوی، ریاست علی ندوی، ڈاکٹر عزیر، یوسف کوکن عمری، ابوالجلال ندوی جیسے اصحاب علم قلم اور دور آخر میں مجیب اللہ ندوی، نعیم صدیقی ندوی نے بھی علیحدگی اختیار کی۔ اس ٹیم ورک کو مضبوط کئے بغیر دارالمصنفین کا تخیل بے معنی ہے۔ یہ نہ تو شاہجہاں کی تعمیر کردہ کوئی خوشنما عمارت کا نام ہے اور نہ ہی یاد رفتگاں کی بانسری بجانے کا مرکز۔ اس ادارے کا تحقیقی عمل تقریباً تیس برس سے یکسر متروک ہے۔ لے دے کر رسالہ معارف بچا ہے جس میں تحقیقی مضامین لکھنے والے سب کے سب دارالمصنفین کے باہر کے ہوتے ہیں۔

خدابخش لائبریری نے بیشمار پرانی کتابوں کو شائع کیا ہے خاص طور پر عابد رضا بیدار صاحب کے زمانے میں گمنام اور نایاب کتابوں کی خوب خوب اشاعت عمل میں آئی ہے، رضا لائبریری کی علمی خدمات کا زیادہ علم تو نہیں ہے لیکن پرانی کتابوں کا ذخیرہ محفوظ رکھنے کا کام وہاں خوب ہوا ہے۔

دارالمصنفین کا المیہ یہ ہے کہ کتابوں سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ عملہ کی تنخواہوں میں صرف ہو جاتا ہے اور ہر پانچ دس سال بعد انہی پرانی کتابوں کو چھپوانے کے لئے قوم کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑتا ہے، جبکہ دارالمصنفین کی بیشتر پرانی کتابیں دہلی اور دیوبند کے ناشرین بغیر عوام سے چندہ لئے چھاپے جا رہے ہیں، اور عوام تک کتابیں پہونچا رہے ہیں۔ ایسے میں دارالمصنفین کے بقاء کا واحد راستہ نئی تصنیفات کی تیاری اور اس کی اشاعت ہے، جس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کیمپس میں مقیم با تنخواہ رفقاء ہی رکھے جائیں بلکہ تمام علمی افراد کو کسی مخصوص موضوع پر کام کرنے کی دعوت دی جائے اور ان کی جو کتابیں دارالمصنفین کے روایتی معیار پر پوری اتریں ان کو شائع کیا جائے۔

افضل عثمانی

(امریکا)

معارف: آپ کا درد قابل قدر ہے لیکن حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ وسائل کی کمی کے باوجود آزادی کے بعد دارالمصنفین میں زیادہ کام ہوا ہے۔ منسلکہ لسٹ سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آزادی سے پہلے ۹۱ کتابیں شائع ہوئیں جبکہ آزادی کے بعد ۱۶۱ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس سال ان شاء اللہ تقریباً ایک درجن مزید

کتابیں شائع ہوں گی۔آپ دارالمصنفین کا تقابل خدابخش اور رضا لائبریریوں سے کر رہے ہیں جبکہ یہ دونوں سرکاری ادارے ہیں جہاں بجٹ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ مالی حالت کی خرابی کی وجہ سے اعلی معیار کے ریسرچ اسکالرز کو ہائر کرنا دارالمصنفین کے بس کا نہیں ہے۔ مولانا مجیب اللہ نے اپنا ادارہ بنالیا تھا،اس لئے الگ ہوئے۔ نعیم صدیقی بہتر ملازمت کے لئے خلیج چلے گئے تھے۔اس میں دارالمصنفین کا کیا قصور ہے؟ باہری مصنفین کی کتابیں پہلے بھی دارالمصنفین سے چھپی ہیں۔ان شاءاللہ اس پر مزید توجہ دی جائے گی۔ توجہ کے لئے شکریہ۔

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ رصفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

رسید کتب موصولہ

اے ماسٹر کیٹلاگ آف دی مینواسکرپٹس اینڈ پبلشڈ ایڈیشنس آف دی ورکس آف مرزا عبدالقادر بیدل (انگریزی) : پروفیسر شریف حسین قاسمی ، پنٹاگن پریس پیکاک لین، شاہ پور جاٹ نئی دہلی۔ صفحات ۲۵۸، سال اشاعت ۲۰۲۳، قیمت ۱۲۹۵ روپے، فون نمبر: ۰۱۱-۴۶۷۰۶۲۴۵

اردو شاعری میں شخصی مرثیے : پروفیسر آفاق حسین صدیقی، بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ، بھوپال۔ صفحات ۲۴۰، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۲۲۹۶۷۳۳۸۸۔

اقبال کے دینی تصورات (چند مباحث) : پروفیسر عبدالحق ، اقبال اکیڈمی (ہند) نئی دہلی۔ صفحات ۲۰۰، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۵۰۴۶۱۳۹۴۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری۔ حیات اور علمی نقوش : مرتب عبدالکریم عبدالعلیم، دارالتحقیق والترجمہ، شاہین باغ، ابوالفضل انکلیو پارٹ ۔۲ جامعہ نگر نئی دہلی۔ صفحات ۵۷۶، سال اشاعت ۲۰۱۷ء، قیمت ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۱۸۰۲۰۳۲

رشید حسن خاں اور قاضی عبدالودود : ڈاکٹر ٹی. آر۔ رینا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، اے. ایم. یو علی گڑھ صفحات: ۱۸۸، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲

رشید حسن خاں کے خطوط (جلد سوم) : ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، بک امپوریم، سبزی باغ ، پٹنہ۔ صفحات ۴۴۶، سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت ۴۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲

مباحث فی الترجمۃ لمعانی القرآن الکریم : ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی، مکتبہ احسان مکارم نگر ، لکھنؤ۔ صفحات ۱۰۴، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: درج نہیں

معلومات بڑھایئے : مولانا محمد اویس قاسمی، ضیاء الکتب، خیرآباد ضلع مئو ، صفحات ۱۶۰، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۳۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۵۳۵۶۱۷۷

مولانا محب اللہ لاری ندوی علیگؒ۔ حیات و خدمات : جمع و تدوین، پروفیسر حکیم جاوید احمد لاری، ترتیب ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، لاری منزل پلاٹ نمبر ۔۶ گلاب پارک مالیگاؤں، ناسک۔ صفحات: ۶۷۲، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۲۷۰۹۳۲۲۱۳

یہی کولکاتا ہے ! (مختصر منظوم ادبی تاریخ) : ڈاکٹر امام اعظم، ناولٹی بکس ، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔ صفحات ۴۳۲، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۳۱۰۸۵۸۱۶

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	300/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	400/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم (اول)	250/-
شعر العجم (دوم)	150/-
شعر العجم (سوم)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-
شعر العجم (پنجم)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
خطبات شبلی	150/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	125/-
سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات فارسی (فارسی)	--
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الکلام	350/-
علم الکلام	200/-
انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print OCT 2023 Vol. 210/10

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	״ ״	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	״ ״	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	״ ״	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	560/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	״ ״	500/-
تاریخ اندلس (۴ جلدیں)	سید ریاست علی ندویؒ	1200/-
مصادر سیرت نبوی	کلیم صفات اصلاحی	600/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	550/-